"شہر خالی، کوچہ خالی"
(کورونا وبا کے شب و روز... ایک ناول)
مستنصر حسین تارڑ

891.4393 Tarar, Mustansar Hussain
Shehar Khali, Kocha Khali /
Mustansar Hussain Tarar.-Lahore :
Sang-e-Meel Publications, 2020.
264pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.



2020ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-3314-3
ISBN-13: 978-969-35-3314-9

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

انتساب

وہ جو ناساعد حالات میں کورونا کی وبا کے
سامنے صف آرا ہو گئے اپنے ہم وطنوں کی
زندگیاں بچانے کی خاطر اور خود موت کے
مُنہ میں چلے گئے اور جنہیں کوئی نشانِ حیدر نہ ملا
اُن کے نام!

۔ شہر خالی، جادہ خالی، کوچہ خالی، خانہ خالی
جام خالی، سفرہ خالی، ساغر و پیانہ خالی
کوچ کردہ، دستہ دستہ، آشنایان، عندلیبان
باغ خالی، باغچہ خالی، شاخہ خالی، لانہ خالی

(شہر خالی، رستہ خالی، محلّہ خالی، گھر خالی ، پیالہ خالی، میز خالی، ساغر اور پیانہ خالی، گروہ در گروہ ہمارے دوست اور بلبلیں کُوچ کر گئے، باغ خالی، باغیچہ خالی، شاخیں خالی، گھونسلے خالی)

۔ وای از دنیا کہ یار از یار مے ترسد
غنچہ ھای تشنہ از گلزار مے ترسد
عاشق از آوازۂ دلدار مے ترسد
پنجۂ خنیاگران از تار مے ترسد

شہ سوار از جادۂ ہموار مے ترسد

ایں طبیب از دیدنِ بیمار ترسد

(افسوس اس دنیا پر کہ جہاں دوست، دوست سے ڈر رہا ہے.. جہاں پیاسے پھول باغ ہی سے ڈر رہے ہیں، جہاں عاشق اپنے معشوق کی آواز سے ہی ڈر رہا ہے، جہاں موسیقاروں کے ہاتھ تار ساز سے ڈر رہے ہیں، شہسوار آسان و ہموار راستے سے ڈر رہا ہے، اور طبیب، بیمار کو دیکھنے سے ڈر رہا ہے۔)

(افغان شاعر اور موسیقار امیر جان صبوری کا کلام
جسے تاجک گلوکارہ نگارہ خالاوہ نے گایا)

''وبا کی تنہائی''

''ہر جانب ہیضے کی وبا پھیلی ہوئی ہے،
ہر جانب کورنٹینا ہے اور خوف ہے،
یہاں تک کہ ادب کے بارے میں سوچنے کا وقت میسّر نہیں،
یہ ''وبا کی تنہائی'' ہے..
البتہ وبا کے ان دنوں میں بہت کچھ ہے
جو دلچسپی کا باعث بن سکتا ہے
اگر آپ ایک لاتعلق نکتہ نظر سے
اس کا مشاہدہ کریں''

(انتون چیخوف 1890ء)

فاختہ اڑان میں ہے اور اُس کے پروں تلے پانی ہیں..

پانی ایک وبا کی مانند ہر سُو بچھے ہوئے ہیں..

جہاں تک اُس کی مہین آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہاں تک پانیوں کے پھیلاؤ کا وبال پھیلا ہوا ہے..وہاں تک جہاں سے کبھی سورج ابھرتا تھا اور وہاں تک جہاں وہی سورج ڈوب جایا کرتا تھا..ایسا ڈوبا کہ اب ابھرتا ہی نہیں..

کیا یہ سورج کی موت ہے اور وہ پانیوں کی قبر میں دفن ہو چکا ہے؟

اگر وہ مر چکا ہے تو کیا اُس کی تدفین کے موقع پر چاند ستارے آئے تھے.اُس کے جنازے کو کاندھا دینے والوں میں کون کون شامل تھا..اگر ستارے آئے تھے تو وہ بھی ڈوبے ہوئے ہوں گے، پانیوں کے شُوکتے سانپوں نے اُن کی روشنی بھی چُوس لی ہوگی..کیا بُجھے ہوئے چاند نے اُس کی قبر کھودی تھی اور اُسے خود لحد میں لٹایا تھا..نہیں سُورج کو دفن کرنے کے لیے کوئی بھی نہیں آیا ہوگا، ہر ایک کو خدشہ ہوگا، اُس کا بدن چاہے کتنا ہی سرد اور زرد ہو چکا ہوگا پھر بھی اُس میں کُچھ نہ کُچھ حدّت تو باقی ہوگی جو غسل دیتے وقت بھاپ کی صورت

اختیار کرتی ہوگی پر اُسے غسل بھی نہیں دیا گیا ہوگا، سب اُس کے لاشے کو ہاتھ لگانے سے ڈرتے ہوں گے کہ کہیں وبا کے وہ جرثومے جو موت کے بعد بھی اُس کے ٹھنڈے پڑے بدن میں کلبلاتے پھرتے ہیں اُن کے بدنوں میں نہ منتقل ہو جائیں.. یوں بھی اُسے غسل دینے کی حاجت نہ تھی کہ اُسے پانیوں میں ہی دفن ہونا تھا..

فاختہ اُڑان میں تھی اور اُس کے پروں تلے سُورج کی قبر تھی..

فاختہ یونہی اُڑان میں نہ تھی، اُسے ایک ذمہ داری سونپی گئی تھی، اُسے اذن دیا گیا تھا کہ اس کرۂ ارض پر تب تک اڑتی چلی جا جب تک تجھے کوئی ایسا مقام دکھائی نہ دے جائے جو پانیوں میں سے ابھرا ہوا ہو، تلاش کر خشکی کے ایک ٹکڑے کی اور اُس پر اتر اور اُس کی نشانی لے کر واپس آ..

اُس کے پھڑ پھڑاتے پروں میں سے وہ حدت زائل ہو رہی تھی جو کشتی والے کے ہاتھوں میں سے جب کہ وہ اُسے تھپک رہا تھا، پرواز کا اذن دے رہا تھا، اُس کے بدن میں منتقل ہوئی تھی..اُس حدت میں طُور کی تپش کی چنگاریاں تھیں، آتشِ نمرود کے شرارے تھے، مصلوب کی آخری سانسوں کی گرمی تھی، غارِ حرا میں سلگ چکے کسی پتھر کی سلگاہٹ تھی، ایسی حدت تھی جو آئندہ کے زمانوں پر بھی محیط تھی۔

تبھی تو وہ اب تک اڑان میں تھی کہ کشتی والے کے ہاتھوں میں ان سب سلگاہٹوں کے نُور کے پرتو تھے جو منتقل ہو چکے تھے اُس کے ناتواں وجود میں اور یُوں وہ ایک روشن چراغ تھی جس کا نُور اڑان میں اُس کی رہنمائی کرتا تھا..

فاختہ اڑی جاتی تھی اور کشتی والے کی ہتھیلیوں کی گرمی جن کی آغوش میں اُس نے اپنے پر کھولے تھے، ہولے ہولے زائل ہو رہی تھی کہ وہ تب سے اڑان میں تھی جب ہر سُو تاریکی چھائی ہوئی تھی اور پانیوں پر ایک دُھند حرکت کرتی تھی اور ہر جانب خاموشی کے قفل تھے اور پھر اذن ہوا تھا کہ روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی تھی اور اب پھر سے پانیوں پر وہی ازلی تاریکی چھا چکی تھی اور یہ تاریکی تب مدھم پڑتی تھی جب فاختہ ایک روشن چراغ کی صُورت اُن پر سے اڑان کرتی گزرتی تھی..

اُسے تب تک اپنی اڑان جاری رکھنا تھی جب تک نیچے ایک وبا کی مانند پھیلے پانیوں میں خشکی کا کوئی ٹکڑا دکھائی نہ دے جائے، اور وہ دکھائی نہ دیتا تھا..

جُوں جُوں اُس کے بدن سے وہ حدّت رخصت ہوتی تھی وہ محسوس کرتی تھی کہ تھکاوٹ کی چمگادڑیں اُس کے پروں تلے اپنے گھونسلے بنانے لگی ہیں، اور وہ بوجھل ہو رہے ہیں. پر تھکاوٹ کی یہ چمگادڑیں ان گھونسلوں کے لئے خس وخاشاک کہاں سے لے آئی ہیں کہ نیچے کرۂ ارض پر محیط پانیوں کی وبا کے ڈیرے ہیں.. نیچے ہر سُو ایک نیم تاریکی کا پھیلاؤ گزرتا جاتا تھا، پانیوں پر شدید بارشوں سے جنم لینے والی دُھند کی نمی تیرتی تھی اور فاختہ کان لگا کر سنتی رہی کہ شائد ایک مرتبہ پھر روشنی ہو جا کی صدا آ جائے پر شائد یہ صدا پہلی اور آخری بار آئی تھی یا پھر صدا دینے والا نہ صرف اُس کا بلکہ کشتی والے کا امتحان لے رہا تھا.. یہ بھی امکان تھا کہ اپنے بھیجے گئے سیلابِ بلا میں اُس کا اختیار بھی ڈوب گیا ہو.. وہ خود بے صدا ہو گیا ہو..

کتنے زمانے ہو گئے تھے اُسے چونچ کھولے ہوئے، چہکے ہوئے، بولے

ہوئے...وقت کے جانے کتنے دھارے بہہ چکے تھے جب آخری بار اُس نے چونچ کھول کر کُوہو کُوہو کی پکار کی تھی..اُس نے چونچ کھولنے کی سعی کی پر وہ کُھلنے سے انکاری ہوگئی، اتنے زمانوں سے بند تھی کہ اُسے عادت ہی نہ رہی تھی کُھلنے کی..جیسے اُس کی چونچ میں ٹانکے لگا دیئے گئے ہوں، دھاگوں سے پرودی گئی ہو اور اگر وہ اُسے زبردستی کھولنے کی کوشش کرے گی تو وہ کُھلے گی نہیں، بُھر جائے گی اور اُس کی پیاسی زبان بے پردہ ہو جائے گی..اگر اُسے کہیں خشکی نظر آ گئی تو وہ کیسے مسرت سے مغلوب ہو کر اپنی خوشی کے اظہار کے طور پر غُل کرے گی. پکارے گی، چہکے گی..اگر وہ چونچ نہ کھول پائی تو کیا کرے گی..

ہاں..وہ پیاسی بھی بہت تھی، نیچے پانیوں کے جو نیلے کفن بچھے ہوئے تھے وہ اُن میں سے ایک بوند بھی اپنے حلق میں اتارنے کی سعی نہیں کر سکتی تھی کہ یہ بے سُود ہوتا..وہ دھاگے جن سے اُس کی چونچ پروئی گئی تھی کہاں کُھلنے تھے..ممکن ہے صرف اُس صورت میں خود بخود کُھل جائیں جب اُس کے نیچے بے انت پھیلاؤ والے وبا پانیوں میں اُسے خشکی کا کوئی ٹکڑا نظر آ جائے..

کشتی والے نے اُس کی شرافت اور پُرامن طبع کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا، اُس کے ساتھ فریب کیا تھا..انسانی اور حیوانی نسلوں کے بقا کے لئے اُس بے چاری کی زندگی داؤ پر لگا دی تھی..وہ اُس کی بجائے جسمانی طور پر مضبوط کسی اور پرندے کو بھی تو اڑا سکتا تھا..اُس کی معصومیت اور بھولپن اُس کی موت کا سامان بننے کو تھے..وہ مان بھی تو گئی تھی..کشتی والا جان گیا تھا کہ اُس کے ننھے سے دل میں وسوسے ہیں..تو اُس نے اُسے سمجھایا تھا کہ میں نے

تمہارا انتخاب کیوں کیا ہے..

اگر میں عقاب کو بھیجتا ہوں تو اس میں سکت بہت ہے لیکن صبر اور شکر اس کی خصلت میں شامل نہیں، یہ نہ بھوک برداشت کر سکتا ہے اور نہ مدتوں پیاسا رہ سکتا ہے.. خود غرض بہت ہے، بہ فرض محال اگر یہ خشکی تلاش کرنے میں کامیاب ہو بھی جائے تو یہ وہیں بسیرا کر لے گا، واپس نہیں آئے گا. تم میں صبر اور شکر کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے.. میں جانتا ہوں تم واپس بھی آؤ گی کہ وفاداری تمہاری طبع میں رچی ہوئی ہے..

کوّے کا کُچھ اعتبار نہیں، وہ وفادار نہیں.. ہُد ہُد شروع سے گھمنڈی تھا، جانتا ہے کہ آئندہ زمانوں میں وہ ایک پیغمبر کا نامہ بر ہوگا.. ابھی سے تکبّر میں مبتلا ہے.. وہ اکڑ کر اپنے پنجوں پر پُھدک تو سکتا ہے لیکن اُس میں طویل اڑانوں کا حوصلہ مفقود ہے..

مُرغِ زرّیں کی اڑان بھی محدود ہے.. صرف تم ہو.. تم ہو جس کی کاوش سے یہ کرۂ ارض پھر سے آباد ہو سکے گا. تم ہو جو نسلِ انسانی کی بقا کی ضمانت دے سکتی ہو، جاؤ، خشکی تلاش کرو.. بخت کی تختی پر رقم ہو چکا ہے کہ سب پرندوں میں سے چناؤ تمہارا ہوگا اور خشکی تمہارے نصیب کی آنکھیں دیکھے گی.. معصوم اور بولی بھالی تھی ناں اِس بہکاوے میں آ گئی، کشتی والے کے پھیلائے ہوئے دام میں آ گئی.. بے شک ڈر کے نابینا پکھیروؤں نے اُس کے دل کو مٹھی میں لے لیا لیکن اُس کے اندر بے پناہ مسّرت اور طمانیت کا ایک بُوٹا بھی پُھوٹا کہ سب پرندوں میں سے کشتی والے نے انتخاب میرا کیا ہے، مُجھے مامور کیا ہے، اُس نے خود سے نہیں کیا، اُس پر میرا انتخاب نازل ہوا ہے.. گویا منتخب مُجھے اُس نے کیا ہے، جس کے اذن سے تندوروں میں سے پانی اُبلے اور روئے زمین پر ایک وبا کی صُورت میں پھیل گئے..

ویسے اگر میری چونچ کسی صُورت کُھل بھی جائے تو میں اس آسمانی تنہائی میں کسے پکاروں گی.. یوسف کُھوہ، یوسف کُھوہ کا ورد تو نہیں کر سکتی کہ یوسف کا ظہور بہت زمانوں بعد ہوگا. ابھی تو اُس کے بھائیوں نے اُسے کنویں میں پھینکنا ہے اور تب میں نے لوگوں کو متوجہ کرنے کی خاطر یوسف کُھوہ یوسف کُھوہ کی دوہائی دینی ہے.. لیکن ابھی کسی کُھوہ کے بارے میں سوچو بھی مت کہ نیچے پھیلے یہ پانیوں کے سیلاب ایک کنویں میں سے ہی تو پُھوٹے تھے.. بھلائی اسی میں ہے کہ چونچ، سلی رہے، جُڑی رہے، تب کُھلے جب پانیوں میں سے خشکی کی نمودار ی ظاہر ہو..

پروں میں تھکاوٹ اور مایوسی کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا اور وہ اس بوجھ کو سہارنے سے لاچار ہوتی جاتی تھی..

تب پہلی بار اُسے خدشہ لاحق ہوا کہ وہ حدّت جو کشتی والے کے ہاتھوں میں سے اُس کے کومل بدن میں میں سرائت کی تھی، وہ کب کی زائل ہو چکی، اُس کی اپنی سکت کی دمک بھی ریزہ ریزہ ہونے کو ہے اور یہ بوجھ تھکاوٹ کے گھونسلوں کا بھی سہارا نہیں جا رہا تو وہ لاچار اور بے دم ہو کر پانیوں کی وبا کا شکار ہو کر اُن میں گر سکتی ہے، سورج کی مانند ڈوب سکتی ہے.

اگر وہ ڈوب گئی تو اُس کی آبی تدفین کے لئے کون کون آئے گا، کیا عقاب پہنچ جائے گا پر اُس نے کہاں پہنچنا ہے، وہ تو ایک مدت سے اُسے اپنا تر نوالہ بنانے کے لئے اُس پر نظر رکھے ہوئے تھا، یہ تو کشتی والے کا کرم تھا کہ وہ ابھی تک اُس کے پنجوں سے محفوظ تھی.. ہُد ہُد تو میری موت کی خبر پا کر شکر کرے گا کہ وہ میری گیتوں بھری کُوکوں سے عاجز آیا

ہوا تھا، اُس کی اپنی آواز جو بھدّی اور بے سُری تھی۔ مور کا یہاں تک پہنچنا بھی دشوار ہے کہ اتنی لمبی اڈاری مارنا اُس کے بس میں نہیں تھا.. مرغ زریں بھی اتنی طویل اڑان کے قابل نہ تھا.. ہاں اگر آئے گا تو میرا جوڑ آئے گا، میرا نر میرا مرد آئے گا.. لیکن مردذات کا کیا پتہ وہیں کشتی میں بیٹھے بیٹھے غمزدہ شکل بنا کر بیٹھا رہے اور دوسرے پرندوں کے ہمدردی کے لفظ قبول کرتا رہے، یہاں تک آنے کا تردّد ہی نہ کرے..

یہ نیچے پھیلے وبا پانیوں کے پھیلاؤ کا افسوں تھا جو اُس کے رتّی بھر دماغ پر اثر کر رہا تھا اور وہ باؤلی ہوئی جاتی تھی.. جب تک خشکی کا ایک ٹکڑا چاہے وہ شکرانے کے نفل پڑھنے کے لئے ایک جانماز جتنا ہی ہو دکھائی نہ دے جائے، اُس کے ذمے جو ذمہ داری لگائی گئی ہے وہ پوری نہ ہو، وہ کیسے ڈوب سکتی ہے... اگر وہ ڈوب جانے والوں میں سے ہوتی تو کشتی والا اُس کا چناؤ کبھی نہ کرتا.. وہ نہیں ڈوبے گی..

نیچے اُس کے پروں تلے بے کراں بے کراں، بے انت بے انت پھیلے پانیوں کی چادر لگتا تھا کہ پُورے کرۂ ارض پر پھیل چکی ہے.. پانیوں اور آسمانوں کا رنگ ایک ہو چکا تھا.. اُس کے پروں کی مانند سُرمئی سُرمئی.. نہ دن تھا اور نہ رات.. ہر سُو ایک گدلاہٹ سی پھیلی ہوئی تھی..

اور وہ اڑان میں تھی..

اُس کے اڑان میں مشغول بدن تلے بچھے پانیوں کے کائناتی پھیلاؤ کی سُرمئی نیم تاریکی میں ایک عجیب سی دمک کے پُھوٹنے کا شائبہ سا ہوا اور اُس نے اپنی مہین آنکھوں کو اُس مقام پر مرکوز کیا اور تب اُن کی سطح میں سے ایک نابینا ڈولفن کی مانند ایک جلتا چراغ

ابھرا.. چراغ بھی نابینا تھا اُسے دیکھ نہیں سکتا تھا پر وہ اسے دیکھ سکتی تھی.. وہ اُسے یوں ابھرتے دیکھ کر ایک ہیجان میں مبتلا ہو کر پھڑ پھڑائی کہ یہ کیا ہے.. چراغ کی لو لپکتی ہوئی ایک کوندے کی مانند لپکتی ہوئی اُس کے پروں تلک آنے لگی جیسے اُسے جلانے کا قصد کرنے کو ہے.. اس لپکتی ہوئی لو میں جانے کیسے کیسے جادو ٹُونے، انجانے سحر اور افسوں پھونکے گئے تھے کہ وہ ان کی اثر انگیزی کی اسیر ہونے لگی، اُس لپکتی لو میں سندیسے تھے، وہ کلام کرتی اُس سے مخاطب ہوتی تھی، اُسے اپنے پاس بُلاتی تھی کہ اے فاختہ تجھے کشتی والے نے خشکی تلاش کرنے کی غرض سے بھیجا ہے ناں تو آ جاؤ.. تھک چکی ہو اتنی کہ چند لمحوں میں خود بخود گر جاؤ گی تو آ جاؤ.. تمہاری تلاش اختتام کو پہنچی.. دیکھو تو سہی، یہاں خشکی ہے.. اتر آؤ..

پر اُسے تو وہاں سوائے پانیوں کی لامتناہی چادر کے اور کُچھ دکھائی نہ دے رہا تھا تو اُس نے نابینا چراغ کی اندھی لو سے مخاطب ہو کر کہا.. تم نے مُجھے اپنے جادو ٹونوں سے اسیر تو کر لیا ہے لیکن مُجھے تو ان پانیوں میں خشکی کا ایک ذرّہ بھی نظر نہیں آ رہا، میں کیسے آنکھیں بند کر کے اتر آؤں.. کوئی فریب ہے جس میں مُجھے مبتلا کیا جا رہا ہے، کوئی سراب ہے.. خشکی نہیں ہے.. ہاں ایک چراغ ہے پانیوں میں سے جنم لیتا ہوا، میں اُسے دیکھ سکتی ہوں.. کیا پانیوں میں چراغ جل سکتے ہیں.. چراغ کی روشنی بھڑک بھڑک کر اُس کی جانب لپکتی ہوئی اُس سے مخاطب ہوتی تھی.. میں اگر کوئی عام چراغ ہوتا تو بجھ نہ گیا ہوتا.. مُجھے تم سے فریب کرنے سے کیا حاصل.. اس امکان پر غور کرو کہ اگر کشتی والے نے خشکی تلاش کرنے کے لئے تمہیں مامور کیا ہے تو ہو سکتا ہے اُس نے خشکی کی نشاندہی کرنے کی خاطر مُجھے بھی پانیوں میں سے ابھارا ہو..

فاختہ کسی حد تک قائل ہونے لگی.. ہاں پانیوں میں چراغ کہاں جلتے ہیں، اگر جلتے ہیں تو اُسے راہ دکھانے کے لئے اُسی نے جلائے ہوں گے.. خشکی ہوگی جو میری تھکاوٹ سے بجھتی مہین آنکھوں کو نظر نہیں آ رہی..وہ قائل ہوگئی، اپنے پروں کا رُخ موڑا، پانیوں پر جلتے چراغ کو اپنی بجھتی آنکھوں میں عکس کیا، چونچ نیچی کی اور تیزی سے نیچے اترنے لگی.. پانیوں میں جلتا چراغ قریب آنے لگا جیسے گئے زمانوں میں جب وہ آسمانوں سے اترتی تھی تو وہ شجر جس میں اُس کا گھونسلا تھا قریب آتا جاتا تھا..ہوا شرلاتے بھرتی ہوئی اُس کے بال و پر کو پھلاتی اڑانے لگی، پانیوں میں ابھرا ہوا چراغ نزدیک آتا گیا اور پھر عین اُس لمحے جب وہ اُس پر گرنے والی تھی فاختہ نے دیکھا کہ نہ وہاں کوئی چراغ ہے اور نہ اُس کی روشنی، وہ یکدم پانیوں میں یُوں غرق ہوئے کہ روشنی کی ایک کرن بھی باقی نہ رہی..وہاں کچھ بھی نہ تھا..وہ آگاہ ہوگئی کہ جہاں وہ نسل انسانی کی بقا کے لئے مامور کر دی گئی تھی وہاں کچھ ایسی قوتیں بھی مصروف عمل ہیں جو نسل انسانی کو ہمیشہ کے لئے ملیامیٹ کرنے کی خاطر اُسے ان پانیوں میں ڈبو دینا چاہتی ہیں..وہ چراغ اور اُس کی نابکار روشنی ایک بہکاوا تھا جس کا شکار ہوتے ہوتے وہ بچی تھی..

فاختہ نے اپنی پوری سکت بروئے کار لا کر اپنے پر سمیٹے اور بُلند ہونے لگی...ہوا کے مرغولے اُس کے پروں کو نوچتے رہے، حائل ہوتے رہے پر وہ اپنی بچاؤ کی آبائی حس کو بروئے کار لا کر بلند ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ پانیوں کی وبا سے آلودہ چادر کا وہ مقام جہاں فریب کا وہ چراغ ایک ڈولفن کی مانند ابھرا تھا اُس سے دور ہوتا گیا. البتہ ہواؤں کی شدت سے نوچے گئے اُس کے چند پر جھنجھیریوں کی مانند گھومتے ہوئے نیچے جا رہے تھے

یہاں تک کہ چراغ کے مقام پر جو بھنور... جو دراصل اُس کا منتظر تھا، اُس میں چکراتے ہوئے دفن ہو گئے..

تب اپنے پروں کا بھنور میں ڈوبنے کا منظر دیکھ کر فاختہ کے مٹھی بھر دل میں تھرتھراہٹ سی خوف کی ہوئی کہ اگر اڑان کی یہ تھکاوٹیں اور پرواز کی لاحاصلگی یونہی اُس کے حواس پر اثر انداز ہوتی چلی گئی. وہ یونہی پانیوں پر جلتے سراب چراغوں کی جانب لپکتی چلی گئی تو پھر اُس کی حیات کا کچھ بھروسہ نہیں، وہ کسی بھی لمحے موت کے شکنجے میں جکڑی جا سکتی ہے تو کیا اس صورت حال میں جو قابو سے باہر کسی بھی لمحے ہو سکتی ہے یہ بہتر نہیں کہ میں پلٹ جاؤں، کشتی والے کے سامنے اپنی ناکامی کے اعتراف میں گردن جھکا کر غٹرغوں غٹرغوں کی درد بھری آوازیں نکال کر شرمندگی سے معافی کی خواستگار ہو جاؤں کہ میں تو اپنی سکت کی سرحد سے بھی پار ہوئی، جستجو میری بار آور نہ ہوئی، سرابوں کا شکار ہوئی، میں نے تو نادانی میں ایک لپکتی لَو کی صدا پر یقین کر لیا، تھکن کے گھونسلوں سے لاچار ہوئی. تو اے کشتی والے میں تمہارے قدموں میں لوٹتی تم سے درخواست گزار ہوں کہ.. مجھے ذرا دم لینے دے.. کچھ دیر کشتی کی عافیت میں آرام کر لینے دے تا کہ تھکاوٹوں کے بوجھ سے میری نجات ہو جائے.

ہواؤں کی شدت کے مرغولوں نے میرے بدن کی کوملتا میں سے جہاں جہاں سے پَر اکھیڑے ہیں تو وہاں اُن کی جڑیں خون آلود ہو رہی ہیں، آج رات میں یہ زخم بھر جائیں گے تو کل سویر تازہ دم ہو کر میں تمہارے حُکم کے مطابق پھر سے خشکی کی تلاش میں اڑان کر جاؤں گی اور تم سے وعدہ ہے کہ تب تک واپس نہیں آؤں گی جب تک خشکی کا کوئی ثبوت چونچ میں بھر کر نہ لے آؤں.. یہ میرا وعدہ ہے.. میرا اعتبار کر لے، ایک شب دم لینے دے.. خشکی کی خبر

لے کر آؤں گی، یہ میرا وعدہ ہے..

فاختہ اپنے فیصلے پر اطمینان کے گہرے سانس بھرتی پلٹ گئی..

تھکن کے بوجھ کو سنبھالتی ایک نئے عزم کے ساتھ لوٹ گئی.. اُس مقام تک پہنچ ہی گئی جہاں سے اُس نے آج سویر اڑان بھری تھی..

اُس نے نیچے دیکھا..

وبا کے پانیوں کی چادر کرۂ ارض کے کونوں تک ہموار بچھی ہوئی تھی.. لیکن اُن کی ہموارگی پر کشتی کا کوئی نشان نہ تھا..

کشتی وہاں موجود نہ تھی..

یہ محبت کرنے کے دن نہ تھے.. محبت مؤخر کرنے کے دن تھے..

یہ تنہائیوں کے دن تھے..

ایسی تنہائیاں جن کی کوئی حد نہ تھی.. کون تھا جو پیش گوئی کر سکے کہ ان کا اختتام سو برس میں ہو جائے گا، شائد وقت کا اختتام ہو جائے پر یہ اُن کی حدود سے بھی پار تک چلی جائیں، ماورا ہو جائیں زمانوں اور قرنوں سے اور چھید کر دیں اس کائنات کی اَن دیکھی چادر میں اور کسی اور کائنات کی مسافتیں اختیار کر لیں..

یہ ایسی تنہائیوں کے دن تھے..

ایک مختصر کمرہ..لان پر کھلتی چھت تک جاتی شیشے کی کھڑکی..گھر کے باہر کی دیوار، ایک منڈیر..

میں ایک ادھیڑ عمر شخص ہوں جس کے منہ میں بکھرے بکھرے چند دانت ہیں، دیر تک ایک ہی نوالے کو منہ میں اِدھر اُدھر دھکیلتا رہتا ہوں اس آس میں کہ یہ کسی ایک دانت کے نیچے آ جائے گا اور میں اسے قدرے چبا سکوں گا..میرے گھٹنے کام تو کرتے ہیں لیکن اٹھتے بیٹھتے ان میں ہلکی سی ٹیس اٹھتی ہے، لگتا ہے آرتھرائٹس کی آمد آمد ہے..میرا دل فی الحال مناسب سُروں میں دھڑکتا ہے، کبھی وقتی طور پر بے راہرو ہوتا ہے تو چند گہرے سانس لینے سے سیدھے راستے پر آ جاتا ہے..بلڈ پریشر کی روزانہ گولی ابھی تک مؤثر ہے، بڑھاپے کے کچھ اور مسائل بھی ہیں جنہیں بیان کرنے سے شرمندگی ہوگی..ڈھل چکی عمر کے تقاضے کچھ تشویشناک نہیں ہیں اور میں اپنے آپ کو مناسب حد تک صحت مند قرار دے سکتا ہوں..اور ہاں پچھلے زمانوں میں، اور وہ زمانے کب تھے اور تھے بھی کہ نہیں، میں بھولتا جاتا ہوں، مجھے سننے میں دقت ہوا کرتی تھی..میں ایک کان سے مکمل طور پر بہرا ہو چکا ہوں اس لئے میں

اسے اپنا نمائشی کان کہا کرتا تھا، البتہ دوسرے کان میں سماعت کی اتنی حِس باقی رہ گئی تھی کہ میں اپنے سے مخاطب شخص کے چہرے کے تاثرات اور جتنا بھی سنائی دیتا تھا، دونوں کی آمیزش سے کسی حد تک سمجھ جاتا تھا کہ مُجھ سے کیا کہا جا رہا ہے..

تمام نیم بہرے بوڑھوں کی مانند جب میرے پلّے کُچھ بھی نہیں پڑتا تھا تو میں اقرار سے اجتناب کرتے ہوئے مسکراتا چلا جاتا تھا.

اس تنہائی کے ساتھ جو خاموشی چلی آئی ہے وہ میرے لئے مُفید ثابت ہو رہی ہے.کورونا کی آمد پر، لاک اپ کے نفاذ کے بعد سے نے پرِ پروانہ سوز دنے چراغ نے گلے والی کیفیت جو طاری ہو چکی ہے اور شہر خالی، کوچہ خالی، جام خالی ایسا خالی پن مقدر ہو چکا ہے تو اس میں ایک نابالغ سا معجزہ رونما ہو گیا ہے...خاموشی کی وجہ سے میں اب بہت بہتر سُن سکتا ہوں، لگتا ہے کہ سماعت جتنی بھی تھی اُس کی حِس خاموشی کی سان پر چڑھ کر تیز دھار ہو گئی ہے.. بلکہ مُجھے بعض اوقات شک گزرتا ہے کہ میرے نمائشی کان کے سنّاٹے میں بھی کُچھ سرسراہٹیں جنم لیتی ہیں..

اُن زمانوں میں میرے گھر کے عین اوپر سے دن بھر میں درجنوں جہاز گزرا کرتے تھے، ایئرپورٹ سے اڑتے تو بُلندی حاصل کرنے کی جستجو میں اُن کے جیٹ انجن پوری قوت سے تب گونجتے جب وہ عین میرے گھر کے اوپر ہوتے تو اُن کے شور سے گھر کے اندر بات کرنی مُشکل ہو جاتی اور تھرتھراہٹ سے کھڑکیوں کے شیشے لرزنے لگتے..

اب آرام ہو گیا ہے..

کیونکہ وہ سب جہاز ایئرپورٹ پر بے جان پڑے ہیں، حنوط ہو چکے ہیں..اگر شہر

خالی ہو گیا ہے، کرۂ ارض خالی ہو گیا ہے تو آسمان بھی ان مہیب آوازوں سے خالی ہو گیا ہے"

تو میں نے بھی بہتر سننا شروع کر دیا ہے..

مجھے تو اس وبا سے افاقہ ہوا ہے..

یہ شہر کی مقفل شدہ حالت کا شائد تیسرا دن تھا جب میں ایک سویر بیدار ہوا،
آنکھوں میں بڑھاپے کی سُستی ابھی چمگادڑوں کی مانند لٹکی ہوئی تھی اور رخساروں کا گوشت
بے جان حالت کے ڈھیلے پن میں تھا جب میرے دونوں کانوں میں باقاعدہ پرندوں کے
غُل کرنے اور چہکنے کی آوازیں اترنے لگیں، بہتر کان میں چہکاریں ذرا بُلند تھیں جب کہ
ناکارہ کان میں بھی نامعلوم سا شور مدھم ہوتا تھا..شائد میں خواب میں تھا کہ میں نے تو ہمیشہ
اگر سُنیں تو پرندوں کی ملفوف سی آوازیں شہر کے شور میں آلودہ سنیں، یُوں صاف شفاف شیشے
کی مانند، دمکتی کھنکتی ایک نویں نکور سکے کی مانند تو کبھی نہ سنیں..تب مُجھے محسوس ہوا کہ یہ
پرندے اپنے شجروں میں نہیں، گھونسلوں میں بھی نہیں، یہ تو میرے کمرے کے اندر چہکتے
پھرتے ہیں، شائد رات کو کھڑکی کُھلی رہ گئی تھی..میں نے مُندھی ہوئی آنکھیں کھول کر دیکھا،
کمرہ خالی پڑا تھا، سٹڈی ٹیبل پر البرٹ کامیو کا ناول ''دے پلیگ'' اوندھا پڑا تھا، میں نے
اسے ادھورا چھوڑ دیا تھا کہ اس میں وبا کے بارے میں کوئی نئی بات نہ تھی..شائد وہ میرے
برابر والے گھر میں رہتا تھا اور آپ جانیئے ان نئی بستیوں میں آپ کو کُچھ خبر نہیں ہوتی کہ

آپ کے ہمسائے میں کون رہائش پذیر ہے.. عید بقر عید پر کوئی ملازم گوشت دے جاتا تھا کہ شیخ صاحب یا میاں صاحب نے بھیجا ہے.. اور خبر تب ہوتی ہے جب گھر کے باہر کاروں کا ہجوم نظر آتا ہے، بنے ٹھنے کلف لگے سفید کرتے شلواروں میں ملبوس لوگ افسوس شکلیں بنائے ان میں سے برآمد ہوتے جاتے ہیں..

تو اگر یہ وبا ممکن ہوگئی ہے تو یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ البرٹ کامیو میرے برابر کے گھر میں رہتا تھا اور میں اُس کی موجودگی سے بے خبر رہا تھا.. یہ امکان قوی تر ہوگیا جب میں نے "دے پلیگ" کا کُچھ حصہ پڑھا کہ یہ تو اِنہی وقتوں کے قصے تھے، یہی اس شہر کے اجاڑ پن کو بیان کیا گیا ہے.. لوگوں کی وہی بے یقینی کہ ہمیں کُچھ نہیں ہوگا، انکار کی وہی کیفیت، اقرار سے کوسوں دور، یہی مُردنی جو شہر میں اٹھتے جنازوں کی نسبت بڑھتی جاتی ہے تو میں خوب آگاہ تھا.. کامیو نے یہیں آس پاس بیٹھ کر یہ ناول لکھا تھا تو میں نے اسے ادھورا چھوڑ دیا..

تو میں نے مندھی ہوئی آنکھیں کھول کر دیکھا تو کمرہ خالی پڑا تھا اور سٹڈی ٹیبل پر "دے پلیگ" اوندھا پڑا تھا.. پرندے نظر نہ آتے تھے، کھڑکی بھی تو بند تھی..

پرندے نہیں تھے تو اُن کی بُلند چہکاریں ہر سُو کیوں غُل کر رہی تھیں.. جیسے وہ میرے کانوں میں گُھس کر شور مچا رہے ہوں.. کہیں یہ میری کتابوں کے شیلفوں کے پیچھے جو خالی جگہ ہوتی ہے اُس میں روپوش ہوکر مُجھے زچ کرنے کی خاطر دنگا تو نہیں کر رہے.. آپ اسے ایک احمقانہ خیال قرار دے سکتے ہیں اس لئے کہ آپ آگاہ ہی نہیں کہ مُجھ ایسے بوڑھوں کے ذہنوں میں کیسے کیسے احمقانہ خیال آیا ہی کرتے ہیں.. بہر طور میں نے اپنی تسلّی

کی خاطر ایک شیلف میں سے کچھ کتابیں کھسکائیں، اُن کے پیچھے ڈھول تو بہت تھی کہ جھاڑ پونچھ کرنے والی لڑکی بھی تو ایک مدت سے ادھر نہ آئی تھی، وہ تو آنے کو تیار تھی لیکن میرے بچوں نے اُس کا داخلہ جب تک وبا کا اختتام نہیں ہو جاتا، ممنوع قرار دیا تھا اگرچہ تنخواہ کی باقاعدہ ادائیگی کے ساتھ..

چنانچہ پرندے کتابوں کے شیلفوں میں بھی پوشیدہ ہرگز نہ تھے..

میں نے آس پاس نگاہ کی کہ کوئی تو سُراغ ملے اور پھر آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے وا کر کے شیشے کے پٹ کھول دیئے اور یکدم پرندوں کی آوازیں پہلے سے بھی کہیں بُلند چہکاریں ایک بے قابو ہجوم کی مانند میرے کمرے میں دندناتی چلی آئیں اور مُجھے حواس باختہ کر دیا..

وہ کمرے میں نہ تھے، کھڑکی کے عین آگے جو مختصر باغیچہ ہرا بھرا تھا اور اس باغیچے کے اختتام پر گھر کی چاردیواری کی جو منڈیر تھی وہ اُس پر بیٹھے ہوئے تھے، درجنوں ہوں گے لیکن لگتے ہزاروں تھے کہ وہ ایک دوسرے کے رنگوں میں مدغم ہو کر گتھم گتھا ہو رہے تھے..

یہ منڈیر میری کھڑکی سے نظر آنے والا واحد منظر تھا جسے میں پہروں بے دھیانی میں تکتا رہتا تھا.. میں حیرت سے پرندوں کے اس جُھرمٹ کو دیکھا کیا.. ویسے اس منڈیر پر پرندے کم ہی اترتے تھے، آج اُن کے جی میں جانے کیا آئی کہ غول کے غول اتر آئے.. بڑھتی ہوئی آبادی کی یلغار نے آہستہ آہستہ کوّوں کے علاوہ سب خوش نظر پرندوں کو دھکیل دیا تھا اور اُنہوں نے مجبوراً اپنے ٹھکانے بدل لئے تھے، شہر کی آخری حدوں سے پرے جو شجر اور جھاڑیاں ابھی تک بُل ڈوزروں کی زد میں نہیں آئے تھے، وہ اُن میں منتقل ہو چکے تھے..

اس منڈیر سے اجتناب کی ایک اور وجہ وہ آوارہ بلّی بھی تھی جو صُبح اور شام باقاعدگی سے ایک پولیس مین کی مانند منڈیر کے آس پاس گشت کرتی رہتی تھی اور سردیوں میں دھوپ تاپنے کی خاطر اس پر انگڑائیاں لیتی ہوئی دراز ہو جاتی تھی.. پرندے ادھر آنے کا خدشہ مول نہیں لیتے تھے.. لیکن آج.. میں حتمی طور پر کیسے بتا سکتا ہوں کہ لاک ڈاؤن کو کتنے روز بیت گئے تھے.. مُجھے تو لگتا ہے کہ ابھی تین دن نہیں ہوئے، صدیاں گزر چکی ہیں اور آج اتنے زمانوں کے بعد پہلی بار اس منڈیر پر مختلف نسلوں کے پرندے بے دھڑک اتر چکے تھے، ٹہل رہے تھے، اٹھک بیٹھک کرتے پھڑ پھڑا رہے تھے اور چونچیں کھولے ایک بے خودی کے عالم میں غُل کرتے شائد مُجھے ہی متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے..

منڈیر پر تو رونقیں لگی ہوئی تھیں اور اچنبھے کی بات تو یہ تھی سب مختلف رنگوں اور نسلوں کے ہونے کے باوجود آپس میں یوں شیر و شکر ہو رہے تھے جیسے ایک ہی خاندان کے فرد ہوں.. ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا، پرندے اگر آپ غور کریں تو کم ہی ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں، کم از کم کوّے تو اپنے سے خوش شکل پرندوں کے بیری ہوتے ہیں، چونچیں مار مار کر اُنہیں ہلاک بھی کر دیتے ہیں اور وہ بھی یعنی کوّے بھی نہائت، بیبے بچّے بنے دیگر پرندوں کے ساتھ چُہلیں کرتے حلیم الطبع ہونے کا ثبوت دے رہے تھے، گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ یہی کوّے انہی پرندوں کے انڈے پی جانے میں مہارت بھی رکھتے ہیں..

منڈیر پر برپا میلے میں ان کوّوں کے علاوہ بلبلوں کا ایک جوڑا تھا اور میں بلبل اور کوئل کے درمیان تخصیص کرنے سے قاصر ہوں، البتہ جو پرندہ دُم اٹھائے اور آپ کو اُس کی بیٹ کرنے کی جگہ سُرخ سُرخ نظر آئے تو میں جان جاتا تھا کہ یہ تو بُلبل ہے. ایک کٹھ بڑھئی

بھی جانے کدھر سے آ نکلا تھا، کلغی تانے رعونت سے ٹہل رہا تھا، ہمنگ برڈز کا بھی ایک جوڑا پیار، کھار ہا تھا، نر تو نہایت رنگین تھا اور بے چاری مادہ بالکل سادہ! چنڈولیاں بھی ان میں شامل تھیں جو غل مچانے میں سب سے آگے تھیں، اور پھر وہ بھورے رنگ کی عام سی گھریلو جھگڑالو چڑیاں جو ایک مدت سے دکھائی نہ دی تھیں آپس میں اُلجھ رہی تھیں، ان کے سوا ایک سرمئی رنگت کی پستہ قامت فاختہ بھی دکھائی دے رہی تھی..

پرندے واپس آ گئے تھے..

انسانی آبادیوں نے اُنھیں جیسے ہجرت کر جانے پر مجبور کر دیا تھا، اُن کے شجر سرکنڈے اور جنگل چھین کر اُنھیں بے گھر کر دیا تھا، اب انسان دبک کر اپنے قید خانوں میں مقفل ہو چکا تھا اور یہ مہاجر اپنے آبائی وطن میں لوٹ آئے تھے، جیسے شائد کبھی فلسطینی مہاجر کسی معجزے کے رُونما ہونے پر اپنے آبائی گھروں میں لوٹ آئیں تو اُن کے چہروں پر جو مسرت پُھوٹ رہی تھی.. اپنے وطن لوٹ آنے کا ہیجان خیز معجزہ..

اور پھر ایک بار پھر ہر سُو وہی سناٹے تھے، ہواؤں کی سرسراہٹ تھی اور اُن کے آبائی جنگلوں کی خاموشی تھی جس نے اُنھیں پکارا تھا کہ واپس چلے آؤ اور وہ چلے آئے تھے..

اور ہاں وہ آوارہ بلّی اُن کی کثرت اور دیدہ دلیری سے خوفزدہ کیکٹس کے کالے پہاڑ کی اوٹ میں دبکی بیٹھی تھی..

مُجھے بلّی کی اس شکست پر بے حد مسرت ہوئی..

پرندے واپس آ گئے تھے..

میں اپنی من مرضی سے نہیں وبا کی مجبوری سے الگ تھلگ ہوا ہوں..

ویسے تو میں ان وبائی موسموں سے پیشتر بھی کم ہی گھر سے باہر نکلتا تھا لیکن تب کوئی قدغن تو نہ تھی، زبردستی تو نہ تھی کہ سٹے ہوم، سٹے سیف!

ایک انسان اگر اپنی نارمل روٹین میں اپنے کمرے کی تنہائی میں یونہی سُستی کا مارا پڑا رہے، کسی کتاب میں مگن رہے یا کسی یاد میں مبتلا رہے اور سارا دن باہر نہ نکلے، بیٹھا رہے تو اُسے اس تنہائی کا احساس تک نہیں ہوتا لیکن اگر ایک پابندی عائد ہو جائے، اُسے منع کر دیا جائے کہ آپ نے گھر سے باہر قدم نہیں رکھنا تو وہ ایک گہری ابتلا میں مبتلا ہو جاتا ہے، اُسے محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر اُسے ایک کال کوٹھڑی میں مقفل کر دیا گیا ہے اور یہ قیدِ تنہائی اُس کے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگتی ہے اور وہ دماغی طور پر کسی حد تک بہک جاتا ہے..

میرے بچوں نے محبت کے مارے، پدرانہ اُلفت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھ پر یہ قیدِ تنہائی لاگو کی ہے کہ دن رات میڈیا پر دوہائی دی جا رہی ہے کہ یہ وبا خصوصی طور پر بوڑھوں

کا شکار کرنے لگی ہے، اُن کے پھیپھڑوں میں سرایت کر کے انہیں پانی کردیتی ہے تو بوڑھوں کو سنبھال لو.. بلکہ میں نے وزیراعظم کی اس تقریر کو بھی ناپسند کیا جس میں اُس نے وبا کے حوالے سے کم از کم چار مرتبہ بُوڑھے بزرگوں کو محفوظ رکھنے کی تلقین کی، اگر صرف ایک بار تذکرہ کردیا جاتا تو کچھ حرج تھا..

تو میرے بچے بجا طور پر میرے بوڑھے بدن کے چوکیدار ہو گئے تھے..

وہ نہایت اہتمام سے ہر وہ شے جو میرے زیرِ استعمال ہے یا میں اُسے چھوتا ہوں، کتابوں کے شیلف، دروازے کا ہینڈل، میزوں، کرسیوں، صوفوں یہاں تک کہ دیواروں پر آویزاں تصویروں پر بھی جراثیم کُش دوائیوں کی پچکاریاں چلاتے ہیں، پورے بستر کو تقریباً نہلایا جاتا ہے، ہر دو چار گھنٹوں کے بعد اس بدبودار عمل کو دوہرایا جاتا ہے اور میرا کمرہ کسی ہسپتال کے انتہائی نگہداشت وارڈ ایسی ادویاتی بُو سے رچ جاتا ہے..

بچے.یعنی میرے پوتے پوتیاں دن میں صرف دو بار میرے کمرے میں داخل ہوتے ہیں، ایک بار صُبح بخیر کہنے کے لئے اور پھر شب بخیر کا فرض ادا کرنے کی خاطر.. پہلے کی طرح میں اُن سے لپٹ کر اُن کے رخساروں پر بوسے ثبت نہیں کرسکتا..وہ سماجی فاصلے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مُجھ سے کچھ دور کھڑے ہو جاتے ہیں، اپنی دونوں کہنیوں کا رُخ میری جانب کر کے گویا سلام کرتے ہیں اور پھر اس ورزش کے بعد وہ اپنے بازو سمیٹ کر اپنے گلے سے لگاتے ہوئے مُنہ سے پُچ پُچ کرتے ہیں اور دادا کو ایک کورونا بوسہ دور سے پچکار کر چلے جاتے ہیں..

کبھی کبھار میں اس شک میں بھی مبتلا ہو جاتا ہوں کہ وہ میرے لئے نہیں، اپنے

بچوں کے لئے فکر مند ہیں، اُنھیں محفوظ رکھنے کے لئے مجھ سے دور رکھنا چاہتے ہیں. میں نے بچپن میں اپنی والدہ سے سُنا تھا کہ اُن زمانوں میں بچے کو کسی بُوڑھے شخص کے ساتھ سلانے سے اجتناب کیا جاتا تھا کہ ناتواں بُوڑھا بدن ایک بچّے کے کومل بدن کی حدّت چُوس لیتا ہے. جس کے نتیجے میں بچّے کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے.. بقول اُن کے اُن زمانوں میں ایسے حادثے ہو جاتے تھے.. نادان مائیں اپنے بچّے کو دادا یا خاص طور پر دادی کے ساتھ سلا دیتی تھیں..

عین ممکن ہے کہ میرے بچّوں نے بھی یہ کہاوت سُن رکھی ہو اور اس لئے وہ وبا کے ان دنوں میں اپنے بچّوں کو مُجھ سے ذرا دور رکھتے تھے. ویسے میں اُن کی تشویش سمجھ سکتا ہوں..

یہ بھی امکان ہے میرے ان وسوسوں نے میری اس مکمل تنہائی کی کوکھ میں سے جنم لیا ہو اور میں خواہ مخواہ اُن کی نیت پر شک کر بیٹھا ہوں..

وبا کے آغاز میں تو اخبار کی ترسیل بھی منقطع کر دی گئی تھی کہ جانے کیسے کیسے ہاتھوں سے گزر کر آتا ہے.. کیا پتہ کسی نے اس کی تہہ جماتے ہوئے اس پر چھینک بھی مار دی ہو.. میں نے اُنہیں بڑی مُشکل سے قائل کیا کہ اخبار میرے لئے اسپغول کا کام دیتا ہے، کموڈ پر بیٹھ کر اس کا مطالعہ نہ کروں تو میری فراغت میں خلل پڑتا ہے، اور پھر مُجھے کُچھ تو علم ہو کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے، میرے کمرے میں تو ٹیلی ویژن بھی نہیں ہے چنانچہ اخبار جاری تو ہو گیا لیکن اس کا ایک پروٹوکول طے تھا.. یعنی جس لمحے اخبار ایک پَر کٹے

پرندے کی مانند پھڑ پھڑاتا گیٹ پر سے نازل ہو کر پورچ کے فرش پر آ گرتا تو اُسے فوری طور پر اٹھایا نہ جاتا بلکہ اُس کے قریب جانے سے بھی اجتناب کیا جاتا جیسے وہ کوئی طاعون زدہ چوہا ہو.. بعدازاں وہ پورے دو گھنٹے دھوپ میں اکڑتا رہتا، پھر میرا بیٹا ماسک چڑھائے نہائت احتیاط سے اُس کے قریب ہوتا اور جراثیم کش دوائی کا چھڑکاؤ کر کے اُس کو بھسا دیتا، پھر ایک گھنٹہ مزید دوائی کی اثر انگیزی کے لئے وقف کیا جاتا، بالآخر دستانے پہن کر اُسے ایک چٹکی میں دبوچ کر مجھے پیش کر دیا جاتا اس شرط کے ساتھ کہ بابا اس کا سرسری مطالعہ کیجئے گا اور پھر فوراً دوبارہ ہاتھ دھو لیجئے گا..

ان حفاظتی اقدام کے بعد میری فراغت کے اوقات میں اگرچہ تین گھنٹے کی تاخیر تو ہو جاتی لیکن کورونا سے بچاؤ کے لئے اور قبض سے بچاؤ کی خاطر انسان کو اتنی سی قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے..

مُجھے ابھی ابھی احساس ہوا ہے کہ شائد میرے بیانئے کی بنیاد پر آپ یہ گمان کر بیٹھے ہوں کہ جتنے روز بھی اس جبری تنہائی کو ہو گئے ہیں تو میں مسلسل اپنے کمرے میں ہی مقید ہو کر بیٹھا رہتا ہوں.. سوائے کھڑکی کے باہر منڈیر پر آ کر بیٹھنے والے پرندوں کے مشاہدے کے اور کُچھ نہیں کرتا، بیکار پڑا رہتا ہوں..

ایسا ہرگز نہیں ہے..

کبھی کبھار ہم سب ناشتے کی میز پر اکٹھے بھی ہو جاتے ہیں، کورونا کے طے شدہ آداب کے ساتھ.. لاؤنج کی دیوار پر نصب ٹیلی ویژن بھی دیکھتے ہیں..

علاوہ ازیں میرے بچوں نے میری صحت کی خاطر اور کورونا کے ناگہانی حملے کے لئے مدافعت بڑھانے کے لئے مُجھے صبح سویرے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کے لیے سیکٹر کے گلی کوچوں میں سیر کی بخوشی اجازت دے رکھی ہے، چند شرائط کے ساتھ کہ اگر کوئی اور شخص سامنے سے آ رہا ہے تو آپ نے فوراً سڑک کے دوسرے کنارے پر منتقل ہو جانا ہے اور اگر بہ فرض محال اُس نے ماسک نہیں پہنا ہوا تو آپ نے اُلٹے قدموں لوٹ کر کسی بغلی گلی میں

نکل جاتا ہے.. اگر کوئی اور بُوڑھا تنہائی سے تنگ آیا ہوا اپنے گھر کے گیٹ سے جھانک کر سلام دعا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو آپ نے بے رُخی اختیار کرنی ہے، اپنے بہرے پن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سُنی ان سُنی کر دینی ہے. واپسی پر وہی راستہ اختیار نہیں کرنا، عین ممکن ہے وہی بُوڑھا گیٹ کھول کر سڑک پر آپ کا منتظر ہو تاکہ مسلسل چُپ رہنے سے اُس کی زبان پر جو کائی جم گئی ہے اُسے اتار سکے.. سیل فون بہر طور ہمراہ لے جائیے.. ایمرجنسی کی صُورت میں فوراً اطلاع کیجئے.. میں نے یہ چند شرائط دل و جان سے قبول کر لیں..

ویسے بچّے بے شک مشروط ہی سہی گھر سے باہر نکل کر صُبح سویرے کُچھ چہل قدمی کی اجازت دیتے ہیں تو اس میں میری ہی بھلائی ہے.. میں نے فلموں میں دیکھا ہے کہ جیل کے وارڈن قیدیوں کی عمومی صحت بحال رکھنے کی خاطر اُنہیں روزانہ اُن کی کوٹھڑیوں میں سے نکال کر عقوبت خانے کے درمیان میں واقع صحن میں ٹہلانے اور ورزش کرنے کے لئے لے جاتے ہیں کہ اُس میں اُن کی بھلائی بھی ہوتی ہے..

---

میں روزانہ اُنہی راستوں سے گزرتا تھا جن پر اُن دنوں میں صُبح سویرے سیر کے لئے چلتا تھا لیکن تب یہ آباد ہوا کرتے تھے اور اب سنسان پڑے ہوتے ہیں تو ان کی ہیئت ہی بدل چکی ہوتی ہے.. جو کُچھ آپ دیکھتے ہیں وہ پہلے دیکھا نہیں ہوا ہوتا، آنکھ کُچھ اور ہی دیکھتی ہے.. منظر اجنبی نظر آتے ہیں اور اُن کی اجنبیت میں سے عجیب معنویت جنم لیتی ہے..

میں آپ کو اس عجیب معنویت کے مشاہدے میں شریک کرتا ہوں..

اگر ایک سڑک تا حدِ نظر مکمل طور پر خالی اور سنسان چلی جاتی ہے تو اُس کا آخری حصہ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے وہ فنا کی کسی سیاہ وادی میں اتر گیا ہے۔
اور اُسی سڑک پر وہ جتنی بھی طویل ہو اگر طرف ایک انسان چلتا ہوا دکھائی دے جائے تو وہ پوری سڑک زندہ لگنے لگتی ہے..

---

سویر کی سیر کے اُن لمحوں میں ہر سُو کوئی ویرانی سی ویرانی ہوتی ہے..اور اس ویرانی کا رُوپ بھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ بھی پہچانی نہیں جاتی کہ اُسے پہلے کہیں دیکھا ہو، محسوس کیا ہو تو پہچانی جائے..اور اگر ویرانی ہی پہچانی نہ جائے تو اُس میں دم بخود گھر اور سناٹے میں گم رہائش گاہیں جنہیں آپ پچھلے زمانوں میں بخوبی پہچانتے تھے، کہاں پہچانے جاسکتے ہیں۔ آپ اُن کے طرزِ تعمیر سے واقف تھے کہ یہ جو بناوٹی یونانی ستونوں والا عالی شان گھر ہے جس کے پورچ میں بھڑکیلے شیشوں والا ایک بڑی قیمت والا فانوس لٹک رہا ہے تو یہ فلاں سیاست دان کا ہے جو قبضہ گروپوں کی شرعی پشت پناہی کرتا ہے کہ یونانی ستونوں کے عین اوپر گھر کے ماتھے پر ایک دھاتی چاندی رنگ کا ''ماشاء اللہ'' آویزاں ہوگا..اور یہ جو چھوٹی اینٹوں کی چنائی سے تعمیر کردہ، طاقچوں والا قدیم طرزِ تعمیر کا ایک خاموش سا گھر ہے جو بگن ولیا کے جھاڑ جھنکار سے اٹا ہوا ہے یہ ایک بوڑھے اور خبطی شخص کی آماجگاہ ہے جو پُرانے دنوں میں یونیورسٹی میں ہیڈ آف فائن آرٹ ڈیپارٹمنٹ تھا...اور یہ جو اینٹوں سے نہیں شیشے سے تعمیر کردہ گھر ہے یہ...معاف کیجئے گا میں بہک گیا، غیر ضروری تفصیل میں چلا گیا..اگر میں سیر کے دوران جتنے گھر راستے میں دائیں بائیں گزرتے ہیں اُن کے طرزِ تعمیر

اور اُن میں رہائش پذیر لوگوں کی تفصیل بیان کرنا شروع کر دوں تو کیا اس تفصیل سے آپ اُکتا نہیں جائیں گے.. یقیناً ایسا ہی ہوگا اس لئے ان کی تفصیل موقوف کرتا ہوں..

تو وہ سب گھر جن کو آپ گئے زمانوں میں پہچانتے جاتے تھے، وبا کے ان ایام کی ویران صبحوں میں اجنبی سے ہو گئے ہیں.. سبھی ایک جیسے لگتے ہیں.. یکسانیت اتنی ہے کہ میں اُکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہوں.. اس تبدیلیٔ ہیئت کا بنیادی سبب تو وہ ویرانی ہے جو ہر سُو طاری ہوتی ہے لیکن اس کے سوا ایک اور بھی منطقی سبب ہے، ان تمام گھروں میں بھی میری طرح کے کُچھ بُوڑھے قید ہوں گے، اُن میں کُچھ کی اُن جیسی ہی عُمر رسیدہ بیویاں بھی ہوں گی، میری تو نہیں ہے، چنانچہ اُن کی پہچان بھی بدل گئی ہے، لگتا ہے سب کے سب عقوبت خانے ہیں چاہے طرزِ تعمیر جو بھی ہو، ان میں بوسیدہ کوٹھڑیاں اور سیلن زدہ تہہ خانے ہیں..

وہ سب ایک جیسے لگتے ہیں کہ تنہائی اور قید تمام پہچانوں کو ملیا میٹ کر دیتی ہے..

چنانچہ میں گھروں کے درمیان سڑکوں پر نہیں عقوبت خانوں کی قطاروں کے پہلو میں چلتا جاتا ہوں اور مُجھے کُچھ طمانیت بھی ہوتی ہے کہ میں اس انجمن میں تنہا نہیں ہوں.. ان قید خانوں میں.. تو ہائے گُل پکاروں میں پکاروں ہائے دل والی بوڑھی عندلیبیں بھی میری مانند پابند ہیں..

میں اس سے پیشتر ''ورٹی گو'' نامی بیماری سے قطعی طور پر نا آشنا تھا البتہ بچپن میں الفرڈ ہچکاک کی ایک سنسنی خیز فلم اس نام کی دیکھی تھی، اس کے سوا ''ورٹی گو'' سے کچھ واقفیت نہ تھی.. شائد یہ مسلسل نظر بندی کا شاخسانہ تھا یا کیا تھا کہ میں اس ناگہانی بلا سے بھی آشنا ہو گیا.. اس کی آمد کے کچھ آثار تو نہ ہوتے تھے، یکدم بیٹھے بٹھائے میری نظر آوارہ ہو جاتی، ہر شے گھومتی دکھائی دینے لگتی.. پہلی بار اخبار سے فارغ ہو کر یونہی بے دھیانی میں خلاء کو تکے جا رہا تھا. اپنے دھنسے ہوئے صوفے میں دھنسا ہوا تھا، مجھے بہر صورت پورے دن میں کم از کم دس گلاس پانی حلق سے اتارنا ہوتا تھا تا کہ میرا بدن ڈی ہائیڈریشن کا شکار نہ ہو جائے.. میں دن کا چوتھا گلاس پینے کی نیت سے صوفے سے اٹھا ہوں تو قدرے چکرا گیا.. سنبھلا نہ گیا اور مجھے وہیں کمرے کے دھول آلود بوسیدہ قالین پر ڈھیر ہو جانا پڑا.. صفائی والی کی شکل ایک مدت سے پرائی ہو چکی تھی اور یوں ہر شے دھول سے اٹی ہوئی تھی.. اب میں وہاں قالین پر ایک ناک آؤٹ ہو چکے باکسر کی مانند بے بس پڑا ہوا ہوں اور کیا دیکھتا ہوں کہ چھت پر ایک کی بجائے متعدد پنکھے گھومتے چلے جا رہے ہیں، دیواروں پر آویزاں تصویریں حرکت

میں آ گئی ہیں، چلنے پھرنے لگی ہیں، شیلف کی کتابیں گویا مزید کتابوں کو جنم دے رہی ہیں، وہ بڑھتی جاتی ہیں.. کوئی شے اپنے مقام پر ٹکتی ہی نہیں، پورا کمرہ چرخے کی مانند گھومے چلا جاتا ہے اور سب کچھ آؤٹ آف فوکس ہو رہا ہے.. اٹھنے کی کوشش کرتا ہوں تو پورا بدن چکرا جاتا ہے.. اور تو اور میں نے وہیں پڑے پڑے اپنا بایاں ہاتھ آنکھوں کے سامنے کیا تو وہ کسی ہندو دیوتا کی مانند درجنوں ہاتھوں میں بدل گیا.. اور اس حالت میں بھی ایک عجیب سا خیال میرے ذہن میں آیا کہ وہ جو درجنوں ہاتھوں والا دیوتا ہوگا وہ وبا کے ان زمانوں میں کیسے بار بار اپنے متعدد ہاتھ دھوتا ہوگا، اُسے تو ہاتھ دھونے سے ہی فرصت نہ ملتی ہوگی..

ویسے آپ اسے خبط کہہ لیجئے یا ایک حماقت کہ میں اس کیفیت سے لطف اندوز ہونے لگا.. کہ کمال ہے پنکھا ایک ہی ہے اور چھت پر پنکھوں کی بہار آئی ہوئی ہے.. تصویریں ہیں کہ مسلسل سیر سپاٹے میں مشغول ہیں.. یہاں تک کہ ایک کی بجائے چار پانچ ٹیبل لیمپ سٹڈی ٹیبل پر زندہ ہو کر چلنے پھرنے لگے ہیں.. لیکن یہ لطف اندوزی صرف پہلی بار پُر کیف اور پُرلطف رہی، بعد ازاں جب ہر دو چار روز بعد ''ورٹی گو'' کا نزول ہونے لگا تو میں اس کی گھماؤٹوں اور بدن کی یکدم بے اختیاری اور لاچارگی سے بیزار ہو گیا اور یکدم اپنی نشست سے اٹھنے یا بلاوجہ گردن گھمانے سے اجتناب کرنے لگا..

میں نے اس تازہ ترین چکر بازی کی خبر بچّوں سے خفیہ رکھی ورنہ وہ فکرمند ہو کر میری صُبح کی سیر پر بھی پابندی عائد کر دیتے..

اُس درخت کے نیچے کالے شاہ کالے شہتوت ایسے پڑے ہوتے ہیں جیسے سُنڈیوں پر سپرے کر دیا جائے تو وہ مردہ پڑی ہوتی ہیں..

ان دنوں اگرچہ بہار کی رُت مرجھا رہی ہے، موسمی پُھول جتنے بھی اس بہار کے نکھار تھے پژمردہ ہو چکے ہیں..البتہ بیگو نیا کے سُرخ اور سفید پُھول ڈھیٹ ثابت ہو رہے ہیں، روزانہ دو چار کِھل ہی جاتے ہیں.. یا پھر بگن ولیا کی بیلدار جھاڑیاں ہیں جو رنگینیوں کی لاج رکھے ہوئے ہیں، جُوں جُوں حدّت میں اضافہ ہو رہا ہے اُن کی ہریاول میں سے رنگ رنگ کے شرارے پھوٹتے ہیں اور وہ شوخی کی شرارتوں میں مشغول ہوتی جاتی ہیں.

اس سارے نباتاتی منظر میں برلب سڑک جہاں سے میں سویرے گزرتا ہوں البتہ ایک شجر ہے جس پر ایک سوگوار اور سیاہ بہار آئی ہوئی ہے، وہ کالے سنپولئے ایسے لامبے شہتوتوں سے بھرا ہوا ہے..

کہا جاتا ہے کہ اگر کسی پُر ہجوم راستے کے کناروں پر ایک درخت باداموں سے لبریز دکھائی دے تو جان لو کہ وہ بادام کڑوے ہیں..اسی طور اگر برلب سڑک ایک درخت سیاہ

شہتوتوں سے بھرا ہوا ہے تو جان لیجئے کہ یہ وبا کے موسم ہیں.. صرف یہ شجر دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ وبا کی دہشت ہے جو اس کے پھل کو محفوظ رکھے ہوئے ہے. میں اِدھر اُدھر دیکھ کر حالانکہ وہاں کون ہے جو مُجھے دیکھتا ہو، رسیلے شہتوتوں کی ایک شاخ جُھکا کر اپنی آنکھوں کے سامنے لاتا ہوں اور اُنہیں چُن چُن کر شاخ سے جُدا کر کے براہ راست اپنے مُنہ میں ڈال کر اُن کے رسیلے پن سے ایک بچے کی مانند لطف اندوز ہوتا ہوں.. اس کے گھیرے کے نیچے پک چکے شہتوتوں کا ایک سیاہ فرش وجود میں آ چکا ہے جو خود بخود شاخوں سے الگ ہو کر گر گئے تھے..

مُجھے شہتوت کے اس درخت پر ترس آتا ہے... کہ وبا کی وجہ سے اس کی اس قدر بے قدری ہو رہی ہے کہ کوئی اس کے رسیلے پھل کی جانب آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا.. کوئی ادھر سے گزرے تو آنکھ اٹھا کر دیکھے، کوئی اور میرے سوا گزرتا ہی نہیں..

زمین پر گرے ہوئے شہتوت بھی پڑے پڑے گل سڑ جاتے ہیں کوئی اُنہیں اٹھاتا ہی نہیں، وہ مردہ ہو چکی سنڈیوں کی مانند پڑے رہتے ہیں..

وبا کا ایک فائدہ تو ہوا، میں روزانہ جی بھر کے شہتوت کھاتا ہوں..

ویران سڑکوں پر کہیں کہیں استعمال شدہ ماسک یوں سمٹے پڑے نظر آتے ہیں
جیسے بیکار ہو چکے کنڈوم پھینک دیئے گئے ہوں..

کیا میں اپنی موت سے خوفزدہ ہوں؟
میں آپ کو اور اپنے آپ کو ابھی آزردہ نہیں کرنا چاہتا..
لیکن آپ، میرے پڑھنے والے اگر اب تک اُکتا کر میری اس بے ربط لکھت
سے کنارہ کش نہیں ہو گئے تو آپ میرے بھیدی ہو چکے ہیں تو ایک بھیدی سے بھید کیا چھپانا،
لیکن ابھی نہیں، میں اس موضوع پر بات کروں گا لیکن ابھی نہیں. میں نہ آپ کو اور نہ اپنے
آپ کو فی الحال اس کے تذکرے سے آزردہ نہیں کرنا چاہتا..

کہا تو یہی جاتا ہے کہ انسان ایک سوشل اینیمل ہے، اُسے اپنے جیسے انسانوں کی رفاقت درکار ہوتی ہے لیکن جس طور اس مسلسل نظر بندی کے باعث بیشتر انسانوں کی طبع میں فرق آتا چلا ہے، اُن کی خصلت دھیرے دھیرے بدل رہی ہے، اُن کی نفسیات میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں تو کرونا کے دنوں میں جب کہ ہم اپنے دوستوں اور قریبی رشتے داروں سے بھی کٹ چکے ہیں تو یہ نظریہ کہ انسان ایک سوشل اینیمل ہے بھی باطل ہوتا نظر آتا ہے.. چونکہ آپ میرے بھیدی ہیں اس لئے میں آپ کو اعتماد میں لے کر ایک اقرار کرنا چاہتا ہوں، جس میں نہ میری کہولت زدہ حیات کا کوئی دوش ہے، نہ میں مردم بیزار ہو چکا ہوں، انسانوں سے ربط اور اُلفت کا میں تہہ دل سے قائل ہوں. میرا خیال ہے میں ایک خود غرض شخص بھی نہیں ہوں.. اس کے باوجود ایک حقیقت بچے بچے مجھ پر آشکار ہو رہی ہے کہ میرے اندر دوسرے انسانوں سے میل جول رکھنے کا جذبہ مفقود ہو رہا ہے.. میرا جی ہی نہیں چاہتا کہ میں کسی سے بھی یہاں تک کہ اپنے سگے رشتے داروں سے بھی ملوں.. کسی کی شکل دیکھنے یا گفتگو کرنے کی خواہش دم توڑ رہی ہے.. یہ بیت قلبی ہرگز نہیں ہے.. کہہ لیجیے

کہ یہ ہیئت تنہائی اور ناگہاں موت کے خدشے کا شاخسانہ ہے..

اس شب و روز کے اکلاپے کے علاوہ اس تبدیلی کا بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ زندگی ایک مخصوص ٹھہراؤ کا شکار ہوگئی ہے.. سب انسان صرف ایک ہی موضوع پر اٹکے ہوئے ہیں، اُن کی حیات بھی ہو بہو اُسی ڈگر پر چل رہی ہے جس پر میری زندگی گامزن ہے..کوئی فرق باقی نہیں رہا، روزانہ کے معمول سب کے ایک جیسے ہیں، جیسے اُنہیں زندگی بسر کرنے کا ہدائت نامہ فوٹوسٹیٹ کروا کے دے دیا گیا ہے اور وہ اُس کی ہر شِق پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں..اور اس شیڈول میں کوئی واضح تبدیلی رونما نہیں ہوتی..نہ کسی کی بدخوئی، نہ کوئی جذباتی حادثہ، نہ آخرت کا خوف نہ اپنے شعبے میں آگے بڑھنے کی تمنا، ہر نوعیت کی خواہشیں تمام ہوتی جاتی ہیں اور کسی بھی شے کی اہمیت باقی نہیں رہی.. یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم پیدائش سے پیشتر کُچھ نہ تھے، اب پھر کُچھ نہیں رہے، ہمارا وجود زائل ہو گیا ہے..ہم پیدا ہی نہیں ہوئے. اگر انسان کے اندر رُوح نام کی کوئی شے موجود ہوتی ہے تو وہ اس وبا کی آمد، اس کی احتیاطی تنہائی اور دوسروں سے کٹ کر زندگی کرنے کے باعث اپنا پنجرہ چھوڑ کر چلی گئی ہے، ہم خالی ہو گئے ہیں..

آپ شائد آگاہ ہوں گے کہ جب کسی سٹیج پر ٹیلی ویژن پر کوئی ڈرامہ کھیلا جاتا ہے تو ہر کردار کے لئے مناسب اداکاروں کو اُس کی سکرپٹ دی جاتی ہے تا کہ وہ اُس کا مطالعہ کرکے اپنے اپنے کردار کی پیچیدگی سے آگاہ ہو جائیں، طے کرلیں کہ کن مناظر میں اُنہوں نے اپنے چہرے پر کونسے منفرد تاثرات تخلیق کر کے اُسے حقیقی زندگی کی قُربت میں لانا ہے..اِن دنوں ایک عجب سانحہ سا ہو گیا ہے..وقوعہ یہ ہوا ہے کہ جب ہم نے اپنی آئندہ

حیات کا سکرپٹ کھول کر پڑھا ہے تو ہم پر کھلا کہ اس میں صرف نام مختلف ہیں لیکن کردار ایک ہی ہے اور ہر اداکار کو وہی ایک کردار ادا کرنا ہے. یعنی آپ کسی کو بھی فون کریں اور اُس کا حال چال اور روزمرہ کا معمول دریافت کریں تو وہ سو فیصد وہی حال بیان کرے گا جو آپ کا ہے.. معمول میں بھی کچھ فرق نہ ہوگا.. کاروبار اور پیشے کے خسارے، دوستوں اور رشتے داروں سے دُوری. وبا کے بارے میں تازہ ترین اعدادوشمار. نئے ٹوٹکے اور تدبیریں. تنہائی کی بیابانی، وبائی لطیفے اور پھر ایک لمبی چُپ.. چنانچہ حیات کے کرداروں میں کوئی تنوع باقی نہیں رہا. سب کردار ایک جیسے ہو گئے ہیں. اُن کے چہرے اگر دکھائی دیں تو وہ بھی ایک جیسے ہو گئے ہیں.. ان کے درمیان کوئی تخصیص باقی نہیں رہی.. سکرپٹ چونکہ سب کرداروں کا ایک ہو چکا ہے اس لئے سب کے مکالمے بھی ایک ہیں.. اسی لئے اگر آپ اُن سے رابطے میں ہوتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے وہ نہیں آپ بول رہے ہیں. جو کچھ آپ کے دل میں ہے وہی اُن کے ہونٹوں پر منکشف ہو رہا ہے اور یوں ہم سب ایسی پتلیاں ہو جاتے ہیں جن کی ڈور وبا کے ہاتھوں میں ہے، وہ جیسے چاہتی ہے آپ اُسی کی مرضی کے تابع زندگی کی سٹیج پر حرکت کرتے ہیں.. یوں جانئے سب کے سب ایسے روبوٹ ہو گئے ہیں جن میں کرونا کی پروگرامنگ فیڈ کر دی گئی ہے..

ہم اپنے اس روبوٹ کردار سے باہر جا ہی نہیں سکتے..

ابتدائی دنوں میں تو فون پر نہائت جذباتی تال میل ہوئے لیکن پھر وقت گزرنے سے رابطے کی خواہش بھی دم توڑتی گئی.. آخر آپ ایک ہی کھیل کتنی بار دیکھ سکتے ہیں، روزانہ وہی مکالمے کیسے سُن سکتے ہیں.. کرداروں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے اور اب وہ چُپ ہو گئے

ہیں، بہت دنوں سے نہ کسی کو فون کیا اور نہ کسی نے فون کیا۔ ہمارے پاس کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا..

اس تغیّر کے باعث مجھ میں یہ احساس جڑیں پکڑ گیا کہ مجھے کسی اور انسان کی ضرورت نہیں رہی اور نہ ہی میں کسی کی کمی محسوس کرتا ہوں، یہ ایک تشویش ناک صورت حال ہے اور مجھے پریشان کرتی ہے، مجھے بھی کبھار خوف آتا ہے کہ اگر کبھی یہ وبا واقعی رخصت ہوگئی، حالات نارمل ہوگئے تو بھی میں کسی انسان سے ملنا پسند نہیں کروں گا.. میں ایک سوشل اینیمل نہیں رہا، کسی پتھر کی دراڑ میں رہائش پذیر ایک راہب کیڑا ہوگیا ہوں، میں اپنی اس پوشیدگی سے باہر آنا پسند نہیں کروں گا..

اگر ہم سب ایک ہی کردار ہوگئے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ باقی لوگ بھی میری طرح راہب کیڑے ہوگئے ہیں اور وہ بھی مجھ سے ملنے کی خواہش نہیں رکھتے ہوں گے..

ویسے میں ان دنوں اپنے اس راہب پن کی کیفیت سے لطف اندوز ہونے لگا ہوں..

بھلا اُس سٹیج پر داخل ہونے سے فائدہ جہاں پہلے سے موجود کردار وہی مکالمے بول رہے ہوں جو آپ نے یاد کر رکھے ہوں..

ٹیلی ویژن کو عرف عام میں ''ایڈیئٹ بوکس'' کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے. لیکن اس عُرفیت سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ کیا اس کی سکرین پر نمودار ہونے والے خواتین و حضرات ایڈیٹ یا احمق ہیں یا پھر اس کی سکرین کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والے ناظرین کو احمق قرار دیا گیا ہے، میرا خیال ہے کہ معاملہ بین بین ہے.. سب لوگ جو اس کی سکرین پر جلوہ گر وغیرہ ہوتے ہیں احمق نہیں ہوتے اگرچہ اکثر ہوتے ہیں اور وہ جو مسلسل سکرین کو تکتے رہتے ہیں وہ بھی نرے احمق نہیں ہوتے، اُن میں سے کُچھ زیادہ احمق ہوتے ہیں.. مُجھے ٹیلی ویژن سے کُچھ زیادہ شغف نہیں ہے لیکن ان غیر معمولی حالات کے پیش نظر باخبر رہنے کی خاطر اس کے سامنے کُچھ دیر کے لئے بیٹھ جانا ایک مجبوری بھی ہو جاتا ہے..

ظاہر ہے غیر معمولی حالات کے باعث ٹیلی ویژن پر بھی غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں.. نشست و برخواست اور لباس میں بھی فرق آ گیا ہے.. مثلاً آپ دیکھتے ہیں کہ میزبان اور حالات حاضرہ پر بصیرت آموز تبصرہ فرمانے کے لئے جو مبصر حضرات تشریف فرما ہیں اور اِن میں سے ایک ریٹائرڈ جنرل صاحب کے بارے میں شک ہے کہ وہ

گھر نہیں جاتے، سٹوڈیوز میں ہی پڑے رہتے ہیں، جس نے پکارا لپک کر چلے گئے، میزبان اور مبصر ان دنوں نہایت اہتمام سے سفید دستانے پہنے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے گمان ہوتا ہے ہم ایک پتلی تماشہ دیکھ رہے ہیں اور ان پتلیوں کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے.. خاص طور جو حضرات سیاسی تبصرہ نگار ہیں وہ ان سفید دستانوں میں صرف پتلیاں نہیں کٹھ پتلیاں دکھائی دیتے ہیں، اور وہ ہوتے ہیں.. کسی کی ڈور حاملہ لفافوں سے بندھی ہوتی ہے اور کوئی کسی فارم ہاؤس کے دھاگوں میں اُلجھا ہوتا ہے.. جب کہ میرے ایک دانش ور دوست میرے اس مشاہدے سے اتفاق نہیں کرتے، اُن کا کہنا ہے کہ یہ پُتلیاں ہرگز نہیں بلکہ سفید دستانے چڑھائے ایسے جادوگر ہیں جو حالات کے مطابق اپنے ہیٹ میں سے کوئی بھی سیاسی خرگوش نکال سکتے ہیں اور ان کے ہاں ہر نوعیت کے خرگوش مل جاتے ہیں.

سیاسی تبصروں کے علاوہ جب میں کسی ڈرامہ چینل کا انتخاب کرتا ہوں تو میں پیش گوئی کر سکتا ہوں کہ اگلے پانچ منٹ کے اندر اندر تین وقوعے لازماً ظہور پذیر ہو جائیں گے.. نمبر ایک، ہیرو صاحب حقوق نسواں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہیروئن کو ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیں گے.. نمبر دو، ہیرو یا ہیروئن ایک دوسرے کو طلاق دینے پر تُل جائیں گے.. نمبر تین، ہیرو کی والدہ مُحترمہ اپنے لاڈلے بیٹے کے کان بھر کر اُسے یوں بدگمان کریں گی کہ وہ اپنی بیوی کو گھسیٹتا ہوا گھر سے باہر نکال دے گا.. علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ سُسر صاحب اپنی بہو پر آنکھ رکھتے ہوں.. لیکن تب رکھتے ہوں جب بیٹا گھر پر موجود نہ ہو.. یعنی کرونا کی مانند ٹیلی ویژن ڈراموں کا سکرپٹ بھی ایک ہی ہوتا ہے.. ویسے میرے پسندیدہ چینل وہ ہیں

جن پر چوبیس گھنٹے کارٹون چلتے رہتے ہیں اور میں انہیں از حد دلچسپی سے دیکھتا ہوں کہ کارٹون کرداروں نے نہ تو ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوتے ہیں اور نہ ہی اُن کے پتلیاں ہونے یا جادوگر ہو جانے کا کچھ امکان ہوتا ہے..

دراصل یہ کارٹون کردار ہی ہمارے معاشرے کے آخری ایماندار اور باضمیر لوگ ہیں..

آج سویر کا قصہ ہے، سیر کے دوران میں نے ایک ایسے رنگین پروں والے چھوٹے سے پرندے کو دیکھا جو نہائت اطمینان سے سڑک پار کر رہا تھا.. میں نے ایسا دل کش اور مختصر پرندہ پہلے نہ دیکھا تھا.. وہ میری آمد سے نہ تو گھبرایا نہ پھڑ پھڑایا بلکہ مستانہ طے کرے ہوں سرِ وادیٔ خیال... کے مصداق مستانہ انداز میں بے خطر چلتا سڑک پار کرتا گیا..

وہ اس ویرانے میں جانے کہاں سے آ نکلا تھا..

بہت شریف النفس ہیں طارق صاحب لیکن میں کسی حد تک اُن سے حسد کرتا ہوں، ماشاء اللہ میرے پڑوسی ہیں اور ایک نہائت بے مقصد اگر چہ سلیقہ مند زندگی بسر کیا کرتے ہیں.. گرمیوں کے آغاز میں ہی اپنی خاموش طبع اہلیہ کے ہمراہ نیوجرسی امریکہ کُوچ کر جاتے تھے جہاں اُن کا ذاتی گھر ہے.. اور پھر سردیوں کے شروع ہونے پر، برفباری کے موسموں کے آغاز ہوتے ہی وہ لاہور لوٹ آتے ہیں اور ظاہر ہے یہاں بھی جو گھر ہے اُن کی اپنی ملکیت ہے جسے اُن کے ملازم اُن کی غیر حاضری میں سنبھال رکھتے ہیں.. بنیادی طور پر میرے حسد کی وجہ اُن کی یہ منصوبہ بندی ہے کہ موسم سرما لاہور کی خوشگواری میں اور گرمیوں میں امریکہ کے ٹھنڈک بھرے موسم.. کیا شاندار بندوبست ہے..

ٹی ایس ایلیٹ ''ویسٹ لینڈ'' میں اپریل کو سب سے ظالم مہینہ قرار دیتا ہے اور اس مہینے میرا شہر بھی لاک ڈاؤن کے لاگو ہونے سے ایک ویسٹ لینڈ کی صُورت اختیار کر چکا تھا.. مُجھے حیرت ہوئی کہ گرمیوں کی حدّت بڑھنے کے باوجود طارق صاحب ابھی تک اِدھر اُدھر منڈلاتے پھرتے تھے.. میں نے مروتاً پوچھا کہ حضور آپ ابھی تک امریکہ

نہیں سدھارے تو روہانسے ہو کر کہنے لگے.. میری ڈاکٹر بہو جو نیو جرسی کے ایک ہسپتال میں
کام کرتی ہے اُس نے فون پر مجھے ایک ہولناک خبر دی ہے.. اُس کا کہنا ہے کہ ان دنوں
امریکہ میں لوگ دھڑا دھڑ کرونا سے مر رہے ہیں.. تو ہم ڈاکٹروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر
وائرس کے شکار مریض کی عمر ساٹھ برس سے زیادہ ہے تو بہ وقت ضرورت اُس پر وینٹی لیٹر
ضائع نہ کیا جائے، تو جوانوں کو ترجیح دی جائے تو ابو آپ نے ہرگز امریکہ کا رُخ نہیں کرنا
چنانچہ میں نے اس تنبیہ کے بعد اس برس پاکستان میں ہی ٹھہرے رہنے کا فیصلہ کیا ہے
یہاں اللہ رحم کرے اگر کچھ ہرج مرج ہو گیا تو بھاگ دوڑ کر کے کسی تگڑی سفارش کا
بندوبست کر کے وینٹی لیٹر کی سہولت تو حاصل کر ہی لیں گے..

مجھے مزید احتیاط کرنی چاہیے، میں تو کرونا کا شکار ہونا افورڈ ہی نہیں کر سکتا. میرے
پاس تگڑی تو کیا کوئی ناتواں سفارش بھی نہیں جسے لڑا کر اپنے اکھڑتے سانسوں کے لیے
ایک عدد وینٹی لیٹر حاصل کر سکوں..

ٹیلی ویژن پر پتلیاں ناچ رہی ہیں اور جادوگر اپنے ہیٹوں میں سے خرگوش برآمد
کر رہے ہیں..

پرندے واپس آ گئے تھے..

وہ جو دن تھا جب اُنہوں نے منڈیر پر آ کر خوب غل غپاڑہ کیا تھا، اتنا چہکتا شور مچایا تھا کہ میں نے یہی جانا کہ گویا وہ کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں گھس آئے ہیں، دراصل ایک پُرشور اعلان تھا کہ ہم آتے جاتے رہیں گے..

لیکن کُچھ ایسے دن بھی ہوتے ہیں جب منڈیر پر کوئی ایک پرندہ بھی نہیں اُترتا تو میں اُن کے لئے اداس ہو جاتا ہوں، ایک گہرے رنج میں اتر جاتا ہوں شائد میری رنجیدگی کی وہ مہک ہواؤں کے سپرد ہو جاتی ہے اور کوئی نہ کوئی پرندہ جیسے غیب سے ظہور میں آتا ہے اور منڈیر پر آ بیٹھتا ہے، وہ بیٹھتے ہی اپنی آنکھیں مجھ پر مرکوز کر دیتا ہے یہ سندیسہ دینے کے لئے کہ دیکھو تمہارے سگے تمہیں چھوڑ گئے لیکن میں تمہاری تنہائی میں شریک ہونے کے لئے آ گیا ہوں.. تو یقین کیجئے میں اُسے صدق دل سے ایسے دعائیں دیتا ہوں جیسے وہ میرا پوتا یا نواسہ ہو.. اللہ تمہیں خوش رکھے، آباد رکھے، صحت مند رکھے، اللہ تمہیں گرم ہوا نہ لگے.. اور وہ ان دعاؤں کے جواب میں ایک بُلند چہکار سے مُجھے نوازتا ہے جیسے کہہ رہا ہو، تھینک یُو اولڈ مین!

یہ منڈیر میرے اکلاپے کی واحد تفریح ہے اور میں اسے دیکھتا رہتا ہوں.. جس روز وہاں پرندوں کی مختلف نسلوں کا ہجوم اتر آئے تو میرا دل ایک سفید کنول کی مانند کھل جاتا ہے اور میں اُسے بہلانے کی خاطر تصور کے تانے بانے بُننے لگتا ہوں.. کہ یہ منڈیر دراصل ایک تھیٹر کی سٹیج ہے اور اس پر کوئی ایسا کھیل کھیلا جاتا ہے جو آج تک کھیلا نہیں گیا.. اس تھیٹر کی خوبی یہ ہے کہ آپ اپنی افتادِ طبع اور اپنے حُسنِ ذوق کے معیاروں کے مطابق دنیا کا کوئی بھی کلاسیک ڈرامہ یا آپرا متشکل کر سکتے ہیں.. اپنی پسند کے کسی بھی کردار کو ڈرامائی انداز میں منڈیر کی سٹیج پر تصور کر سکتے ہیں..

مثلاً یہ جو لالیاں یا مینائیں ہیں، ہمہ وقت چونچیں چلاتی، سوتنوں کی مانند آپس میں لڑتی مرتی رہتی ہیں، یہ بخوبی میکبتھ کی تین چڑیلیں ہو سکتی ہیں.. ویسے تو کوّے بھی اپنے سیاہ کاسٹیوم کی نسبت ان کرداروں کے لئے زیادہ موزوں ہو سکتے ہیں لیکن میں نے کم از کم ایک بہت کائیاں کوّے کو شائیلاک کے کردار کے لئے بچا رکھا ہے.

اب آپ معاون ثابت ہو سکتے ہیں کہ ہیملٹ کا پیچیدہ کردار کس پرندے کے سپرد کیا جائے کہ وباؤں کے ان موسموں میں وہ ایک کھوپڑی سے مخاطب ہو کر جب یہ مکالمہ ادا کرے گا کہ... ٹُو بی آر ناٹ ٹُو بی.. تو یقین کیجئے خوف سے لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے، کھوپڑی پر جلی حروف میں ''کرونا'' لکھا ہوا ہوگا.. بدقسمتی سے میری منڈیر پر کوئی عقاب نہیں اترتا ورنہ وہ اوتھیلو جیسی بارعب شخصیت کی ترجمانی کرنے کا اہل ثابت ہو سکتا ہے..

اور ہاں رومیو اینڈ جولیٹ کی کاسٹنگ کے لئے مجھے چنداں دشواری نہ ہوگی، یہ

جو آپس میں چہلیں کرتی بلبلیں ہیں آخر یہ کس کام آئیں گی. یہ جب اپنی دُمیں اٹھا کر اپنے
سُرخ سُرخ حصے کی نمائش کریں گی تو شائقین خوب تالیاں بجائیں گے اور یُوں ڈرامے میں
جنسی اپیل منٹ بھی لُطف دے جائے گا..

کبوتر، خاص طور پر سفید کبوتر کم ہی میری منڈیر پر اترتے ہیں، جانے کہاں گم
ہو گئے ہیں، اگر وہ آ جائیں تو میں فوری طور پر ''سنولیک'' کا بیلے آپرا ترتیب دوں گا اور
سب سے نخریلی کبوتری کو مرکزی بیلے رینا بناؤں گا کہ کبوتروں کی چال میں بیلے رقص ایسے
نپے تُلے اور نازک قدم ہوتے ہیں..

گھریلو چڑیوں کو تماشائیوں کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے، وہ غُل کرنے کا
فریضہ بخوبی سرانجام دے سکتی ہیں..

منڈیر کی دیوار کے سائے میں چار رنگوں کے پُھولوں کی نگن ولیا بہت جنگل
ہو رہی ہے، اس کے اندر بھی کچھ نامعلوم پرندے قیام پذیر ہیں جو کبھی باہر نہیں آئے...

یہ بہار کے دن ہیں.. پُھوٹ کے دن ہیں، ان کے بارے میں کہاوت ہے کہ
ان دنوں میں تو پتھر میں سے بھی کونپلیں پُھوٹ پڑتی ہیں..منڈیر کے ایک کونے میں کالا پتھر
نام کا ایک قدآور کیکٹس تعینات ہے. جس کی بناوٹ لاکھوں برسوں سے حنوط شدہ مٹ چکے
شجر کی شکل کی ہے اور اُس میں ایک ہیبت ہے، اس کالے پہاڑ سے پرندے خوف کھاتے
ہیں، منڈیر پر اترتے ہی احتیاط کرتے ہیں کہ کہیں اس کے تیکھے کانٹوں کا شکار نہ ہو جائیں..

کھڑکی کے پار اس منڈیر کو تکتے ہوئے، اسے تصوّر کی آنکھوں میں اتار کر اس کی
سٹیج پر اپنا کوئی دل پسند ڈرامہ دیکھتے ہوئے خدشے کا ایک بے نام بھاری پتھر، کالے پتھر کی

ہیبت والا میرے دل کی جھیل کے پانیوں میں اترتا جاتا ہے کہ.. میں روز اس منڈیر کی سٹیج پر کھیلے جانے والا ڈرامہ دیکھتا ہوں.. وہ دن بھی آ سکتا ہے جب وبا میرے بڑھاپے کی جانب کھنچی چلی آئے گی، میں کھانس کھانس کر بے دم ہو جاؤں گا، بخار کی حدت مجھے پھونک ڈالے گی، خوشبوؤں اور ذائقوں سے عاری ہو جاؤں گا، میرے بوڑھے پھیپھڑے وبا کے وار کو سہہ نہ پائیں گے اور مُنہدم ہو جائیں گے، میرے گلے میں موت کا گھنگھرو بجنے لگے گا.. اور میں نہ رہوں گا..

میں نہ ہوں گا تو منڈیر کا کھیل کون دیکھے گا..

شہر کی ویران سڑکوں پر کہیں کہیں استعمال شدہ ماسک یوں سمٹے پڑے ہیں جیسے
بیکار ہو چکے کنڈوم پھینک دیئے گئے ہوں..
ان بے آباد وقتوں میں شہر کی سڑکوں پر کاٹھ کباڑ اور بھی تو بکھرا پڑا نظر آتا ہے تو
پھر وہ استعمال شدہ ماسک ہی کیوں میرے مشاہدے میں مرکوز ہوئے اور اگر ہوئے
تو وہ مجھے بیکار ہو چکے کنڈوم ہی کیوں دکھائی دیئے..
اس لئے کہ دل میں بیٹھ جانے والی سوگوار تنہائی کے ان موسموں میں سوچ کے
دھارے عجب سمتوں میں بہنے لگتے ہیں. اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اکیلے کی فسوں کاری
اور جنسی طلب کا آپس میں گہرا رشتہ ہے.. میں یہاں ہرگز وبا زدہ یورپ اور امریکہ میں
کنڈوموں کی کمیابی کی جانب اشارہ نہیں کر رہا.. بلکہ انسانی نفسیات کی پہنائیوں میں پوشیدہ
ایک ایسی خواہش بلکہ بے اختیاری کی جانب توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں جس کے بارے
میں ہم میں سے بیشتر لاعلم ہیں بلکہ اس کی موجودگی کی شدت سے نفی کریں گے.. یعنی موت کا
ڈر یا کسی عزیز کی موت کے بعد رنج والم کی جو کیفیت انسان کے حواس معطل کر دیتی ہے اُس

کی شدت کم کرنے کے لیے جنسی عمل بے حد معاون ثابت ہوتا ہے..

موت، ناگہانی حادثے یا دُکھ کا اور جنسی عمل کا آپس میں کیا رشتہ ہے، اس کی توجیہہ کی اُلجھنیں شائد فرائڈ اور ژونگ کی تحریروں میں سلجھی ہوں لیکن حتمی طور پر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا.. ہم مشرقیوں کی نفسیات اور مغرب کے باسیوں کے نفسیاتی مسائل سراسر الگ ہیں اور ہم اُن کے نفسیات دانوں کی تحقیق کو مکمل طور پر اپنے آپ پر منطبق نہیں کر سکتے.. دُکھ اور جنسی عمل کے ربط کا سلسلہ شائد ہماری سرزمین کی قدامت اور توّاہم سے جُڑا ہوا ہے.

میرے بچپن کے ایک دوست جن سے ہر نوعیت کی قُربت بُہت تھی اُنہوں نے مجھے قدرے شرمندگی سے اپنے ایک ذاتی تجربے میں شریک کیا تھا.. اُن کی والدہ کا انتقال ہو گیا.. اُن کا کہنا تھا کہ غم کی شدت اس قدر تھی کہ وہ ایک نیم بیہوشی کے عالم میں چلے گئے اور اُنہیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ گریہ کرنے کی شدت سے اُن کی آنکھیں لکڑی کی مانند خشک ہو چکی تھیں اور وہ چٹخیں گی اور اُن میں سے خون پھوٹ نکلے گا اور وہ پھٹ جائیں گی.. لیکن اس کے باوجود رات کو جب وہ اپنی بیوی کے پہلو میں لیٹتے تو اُن کے اندر جنس کی شدت زور کرنے لگتی اور بالآخر اُنہوں نے اپنے آپ کو بہت حقیر اور ذلیل سمجھتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے.. اُن کی خشک ہو چکی آنکھیں پھر سے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں، لذت اور اذیت کے دھارے پہلو بہ پہلو بہتے گئے. لیکن حیرت انگیز طور پر جذباتی حوالے سے اُنہوں نے اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کیا اور خاصے سنبھل گئے..

ازاں بعد اسی نوعیت کے دیگر سانحے بھی میرے ذاتی مشاہدے میں آئے. جن کا دُکھ جنسی قربت سے مندمل ہوا..

اگر سڑک پر پڑے ماسک کو دیکھ کر میری توجہ ایک کنڈوم کی جانب بھٹک گئی تو یقیناً اس کا سبب بھی ہر سُو پھیلی ہوئی وبا کا وہ خوف تھا جو بدن کی دیگر حسیات میں جاگزیں ہو چکا تھا..

ویسے تو مُجھے ان معاملات میں بیکار ہوئے مدتیں گزر گئیں تو پھر یہ کیا تھا، وبا کا ہول ہے یا کیا ہے کہ میں اپنے بدن کی کب کی طاری ہو چکی خوابیدگی میں ایک سرسری سی بیداری محسوس کرنے لگا ہوں..

آج نیل کٹر کی تلاش میں، ناخن بہت بڑھ گئے تھے، میں نے اپنی سٹڈی ٹیبل کا دراز کھولا اور پورا کھولا تو ایک حیرت انگیز شے برآمد ہوئی.. یہ میرا جیبی بٹوہ تھا جس کے ماند پڑ چکے بھورے چمڑے پر میرا نام کندہ تھا اور وہ بھی مدھم ہو چکا تھا.. بٹوے کو یوں اچانک اپنے سامنے پا کر میرا دل خوشی سے بھر گیا کہ ایک زمانے میں یہ میرا دائمی ساتھی ہوا کرتا تھا..اس کے بغیر میں کب گھر سے نکلتا تھا اور اب اتنے عرصہ سے یہ اس دراز میں فراموش شدہ حالت میں پڑا تھا..وہی ملاقاتی کارڈ، ایک دو رسیدیں، شناختی کارڈ کی نقلیں اور چند سو روپے جُوں کے توں پڑے تھے.تب تو یہ میری زندگی سے جُڑا ہوا تھا، زندہ لگتا تھا، اب تو لگتا ہے کہ مر گیا ہے..

جیسے گھنے جنگلوں میں حیات کرنے والے جانوروں کے اندر ایک ایسا حسیاتی نظام نصب ہوتا ہے جو خطرے کی صورت میں اُنہیں فوراً چوکنا کر دیتا ہے۔ کہیں جنگل کی گھناوٹ کے اندر اتری ہوئی خاموشی میں کوئی ٹہنی ٹوٹتی ہے تو وہ خبردار ہو جاتے ہیں.. یقین جانئے تنہائی اور خاموشی کے اِن وبائی دنوں میں میرے بدن میں بھی وہی حیوانی حسیات بیدار ہوگئی ہیں.. ذراسی آہٹ سے میں بھی فوراً چوکنا ہو جاتا ہوں.. گھر میں کسی برتن کے گرنے کی آواز گونجے تو میں ہوشیار ہو جاتا ہوں کہ پتہ نہیں کیا ہے..

کہیں گھاس کاٹنے والی مشین چل رہی ہوتی ہے تو میرے کان کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہ گھر گھر کی آواز کیا ہے.

ایک روز میں اپنے کمرے کی خاموشی میں بیٹھا خالی منڈیر کو تکتا جا رہا تھا کہ اُس کی سٹیج پر ابھی تک کوئی پرندہ اداکار داخل نہیں ہوا تھا جب میرے کانوں میں ایک پُرارتعاش آواز اتری جو نزدیک ہوتی جاتی تھی.. میرے اندر حفاظتی نظام کی تمام تر حسیات بیدار ہو گئیں کہ یا وحشت یہ کیا شے ہے.. یہ آواز بہت ساری آؤٹ آف ٹیون اور گھگھیائی

ہوئی مشینوں کی تھی جو بُلند ہوتی جاتی تھی.. میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہوئی جاتی تھی جب اس ارتعاش بھری آواز کی اجنبیت ختم ہوگئی اور وہ میری پہچان کے فریم میں نصب ہوگئی.. کوئی جیٹ ہوائی جہاز نزدیکی ایئرپورٹ سے اڑان کر رہا تھا اور میری رہائش گاہ پر سکوت میں آئے ہوئے آسمان میں بُلند ہو رہا تھا..

یہ ایک انہونا وقوعہ تھا. تمام پروازیں معطل ہو چکی تھیں، ہوائی جہاز سب کے سب کب سے حنوط شدہ حالت میں ساکت تھے، ایئرپورٹ بھائیں بھائیں کر رہا تھا تو یہ جہاز کدھر سے آ گیا.. کیا اس جہاز کی اڑان ثابت کرتی تھی کہ بالآخر وبا رخصت ہوگئی ہے، حالات معمول پر آ گئے ہیں اور میری قید تنہائی کے آخری لمحے وارد ہو گئے ہیں.. ایک اشتیاق بھری سنسنی میرے سارے بدن میں پھیل گئی اور میں فوراً اپنے گھر سے باہر آ گیا.. آسمان خالی تھا، جہاز اوجھل ہو چکا تھا لیکن ایک ہلکا سا ارتعاش اب بھی سُنائی دے رہا تھا..

میں اُس بچے کی مانند تھا جو ریل گاڑی دیکھنے کے چاؤ میں آیا تھا اور گاڑی گزر چکی تھی، اُس کے کانوں میں سائیں سائیں دفن ہوتی جاتی تھی.

جیسے کسی خاتون کے ایّام میں رکاوٹ آ جائے تو وہ یہی قیاس کرتی ہے کہ وہ حاملہ ہو چکی ہے اور جب دو چار روز بعد ایام پھر سے جاری ہو جائیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ ایک فالز الارم تھا.. بس ایسے یہ اس جہاز کا گزرنا بھی ایک فالز الارم ثابت ہوا.. یہ کسی غیر مُلکی ایئرلائن کا جہاز تھا جو اپنے ملک کے سفارتی عملے کو یہاں سے لے جانے کے لئے خصوصی اجازت سے آیا تھا.. آیا اور چلا گیا..

نہ وبا رخصت ہوئی تھی نہ ہی میری قید تنہائی.. فالز الارم تھا..

امریکہ میں مُقیم ایک بیٹی نے اپنے بوڑھے باپ کو ایک میسج بھیجا ہے.. "ابو اگر مُجھے
کُچھ ہو جاتا ہے تو آپ یہاں نہیں آ سکیں گے.. اور اگر آپ کو وہاں کُچھ ہو جاتا ہے میں نہیں
پہنچ سکوں گی.. اس لئے اپنا خیال رکھئے گا.."

دن تو کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتا ہے..

بچے ایک دو بار میرے کمرے میں داخل ہو کر دور سے ہی اپنی کہنیوں کے اشاروں سے مُجھے ہیلو دادا کہتے ہیں اور گلے ملنے کی اداکاری کر کے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھار کھانے کی میز پر بھی سماجی دُوری کو مدنظر رکھتے ہوئے، کرسیاں مناسب فاصلے پر رکھ کر خاندانی اجتماع ہو جاتا ہے.. اور کُچھ نہ ہو تو منڈیر کی سٹیج پر کوئی کھیل شروع ہو جاتا ہے.. لیکن سورج کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی ڈوبنے لگتا ہے. اور رات کا ہول مُجھے اپنے آپ میں دفن کرنے کے لئے چلا آتا ہے.

اصل یُدھ تو رات کو پڑتا ہے..

دن کے جتنے وسوسے ہوتے ہیں، خوف اور وہم جس قدر ہوتے ہیں، وہ تمام ڈراوے اور ہول جو دن کی روشنی میں اپنی گپھاؤں میں گھات لگائے منتظر ہوتے ہیں، دانت نکوستے، غراتے ہوئے باہر آجاتے ہیں.. نیند کی گولیاں پھانکنے کے باوجود نہ میں سوتا ہوں نہ میں جاگتا ہوں، نہ زندہ ہوتا ہوں نہ مرتا ہوں کہ نیند کو بھی تو عارضی موت کہا جاتا ہے.. یہ

سب بلائیں رات کے اندھیارے میں میرے سینے پر سوار ہو کر مجھے یوں نوچنے کی کوشش
کرتی ہیں جیسے گدھ مردار کو نوچتے ہیں. نہ میں بیدار نہ میں خوابیدگی میں مبتلا ہو کر
داستانوں میں موت کے جتنے رُوپ ہوتے ہیں وہ سب جانے کہاں سے نازل ہو جاتے
ہیں. موت کے یم کُتے اپنی غاروں میں سے نکل آتے ہیں، اُن کا وجود تاریکی میں تاریک
ہوتا ہے صرف اُن کی آنکھوں میں سلگتے فنا کے الاؤ دکھائی دیتے ہیں.. لیکن یہ سب ڈراوے،
ہول اور خوف کی بلائیں یم کے کُتے مُجھے شکار نہیں کر سکتے کہ مُجھ میں بھی تو اپنے بچاؤ کی
حیوانی حس بیدار ہو چکی ہے. یہ مُجھے شکار نہیں کر سکتے.. لیکن کب تلک.. وبا کی رخصتی تلک.. اور
وہ کب ہو گی.. اگر نہ ہوئی تو اس دوران کہیں یہ جانوروں والی حس معدوم تو نہ ہو جائے گی.
اور مُجھے بہر طور.. نصیب کی تختی پر شائد رقم ہو چکا ہو کہ مُجھے بہر طور شکار ہونا ہے..
کبھی کبھی مُجھے خشک کھانسی کا دورہ پڑتا ہے اور بخار بھی محسوس ہوتا ہے.. کہیں یہ

شکار ہو جانے کی ابتدائی علامتیں نہ ہوں..

وہاں ایک ہرن تھا..

میرے گھر سے باہر منڈیر والی دیوار کے آگے، جھاڑیوں سے اٹا، موسمی پھولوں سے آراستہ جو اب مُرجھائے جاتے تھے، سڑک کے کناروں پر ہریاول بھرا مستطیل ٹکڑا تھا،

وہاں ایک ہرن تھا..

وہ سر جھکائے بے تحاشا اُگی ہوئی گھاس پر مُنہ مار رہا تھا.

ایسی بے خبری اور پُر اعتمادی سے جیسے اپنے ویرانے کی جڑی بُوٹیوں پر مُنہ مار رہا ہو..اپنے آبائی صحرا کی جھاڑیوں کی جُگالی کر رہا ہو اور اُسے عادت ہو یہاں چرنے کی، یہ اُس کی ذاتی چراگاہ ہو..

میں حسب معمول اپنی صُبح کی اب تو اُکتا دینے والی سیر سے واپس آیا تو وہ میرے گھر کے باہر گردن جھکائے گھاس پر مُنہ مار رہا تھا..

وہاں ایک ہرن تھا..

میں نزدیک ہوا تو میرے قدموں کی دھمک سے یکدم اُس کے کان کھڑے

ہو گئے، اُس نے ایک کان کو خفیف سا بل دے کر اس دھمک کی سمت کا تعین کیا اور
میری قربت کی بُو سونگھ کر اپنے نتھنوں کو سکیڑا۔ لیکن جیسا کہ میں توقع کر رہا تھا وہ مجھے قر
پا کر ٹھٹک کر قلانچیں بھرتا فرار نہ ہوا۔ نہایت مطمئن کیفیت میں اپنے مقام پر بے خطر کھڑا رہا
اپنی ہرن آنکھوں سے مجھے تکتا رہا کہ یہ دخل انداز کب رخصت ہو اور میں گھاس سے دوبارہ
رجوع کروں۔

سبھی ہرن شاعری کے چوکڑیاں بھرتے دل نشیں غزال نہیں ہوا کرتے اور نہ ہی
وہ آہو چشم وغیرہ ہوتے ہیں۔ اُن میں سے بیشتر کی شکلیں عامیانہ سی ہوتی ہیں، آنکھوں میں
بھی کشش نہیں ہوتی بلکہ اُن پر ہرن سے زیادہ ایک ارتقا پذیر بکری کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن یہ
ہرن تو واقعی ایک غزال تھا اور باقاعدہ آہو چشم بھی تھا۔۔ وہ ایک شاندار مُہاندرے والا ایسا
خوش بدن اور خوش رو ہرن تھا جس کی شبیہ قدیم سکوں پر ابھری ہوئی ہو سکتی ہے۔۔ وہ مجھے
ایسے تکتا تھا جیسے اُس نے نہیں، میں نے اُس کی ذاتی جائداد میں مداخلت کی ہو، مُخل میں ہوا
ہوں۔۔ وہ کسی حد تک شکائت آمیز نظروں سے مُجھے تکتا رہا اور آپ جانئے وہ تھا بھی تو
آہو چشم چنانچہ اُس کی آنکھوں میں سے شکائت کے تیر بھی تو تیکھے ہو کر نکلتے تھے۔۔

"تم کون ہو بھئی؟" میں نے بالآخر پوچھا۔

"دیکھتے نہیں کہ میں ایک ہرن ہوں۔" اُس کی آنکھوں میں شکائت کے ساتھ
ناراضی بھی اتر آئی۔۔

"ہرن تو ہو لیکن کہاں کے ہو؟ کیا لال سوہانرا پارک سے فرار ہو کر آ گئے ہو کیونکہ
میں دیکھ سکتا ہوں کہ تم محض ایک ہرن نہیں بلکہ ایک بلیک بک ہرن ہو۔۔ یا پھر خیر پور میرس

کے مہرانوں جنگلوں کے باسی ہو اور بھٹک کر ادھر آ نکلے ہو.. کہاں کے ہو؟''

''تم کہاں کے ہو؟'' اُس نے بدتمیزی سے پُوچھا کہ وہ ایک باتیں کرنے والا

ہرن تھا..

''میں.. میں تو یہاں کا ہوں..''

''نہیں تم نہیں، میں یہاں کا ہوں.. نہ میں لال سوہانرا پارک سے آیا ہوں اور نہ ہی مہرانوں کے جنگلوں سے بھٹک کر ادھر آ نکلا ہوں.. یہ میرا آبائی ویرانہ ہے جہاں مدّتوں پہلے میں رہا کرتا تھا. اور تم جیسے خود غرض انسان دندناتے ہوئے یہاں آئے اور مُجھے اپنی ہی سرزمین سے بے دخل کر دیا اور یہاں اپنے بھدّے اور بے رُوح گھر بنالئے.. اور میں بے گھر ہو گیا، مہاجر ہو گیا اور ایک مدت اجنبی صحراؤں میں دربدر ہوتا رہا.. میں نے صحرائے تھر میں پناہ لینے کی کوشش کی تو وہاں کے آبائی موروں نے مُجھے چونچیں مار مار کر ادھ موا کر دیا کہ آبادکاروں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا.. چولستان کی جانب رُخ کیا تو وہاں میرے اپنے ہم جنسوں نے، مقامی ہرنوں نے مُجھ مہاجر کو قبول نہ کیا کہ جاؤ اپنے وطن واپس جاؤ اور میرے وطن پر تو تم جیسے کٹھور دل انسانوں نے قبضہ کر لیا تھا.. اور یُوں میں دربدر ہوتا رہا.. تب میں نے دیکھا کہ انسان گھبرائے پھرتے ہیں، اُن کے شہر خالی ہو گئے ہیں، کوچے ویران ہو گئے ہیں تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں اپنے باپ دادا کے ٹھکانوں پر واپس جاؤں، جہاں سے میں نکالا گیا تھا وہاں لوٹ چلوں.. اور میں لوٹ آیا.. اور اب میں اپنے آبائی ویرانے میں پھر سے آباد ہونے کے لئے آ گیا ہوں..''

''مُحترم ہرن یہ ویرانہ ہے؟ یہ تو رونق بھری بستیاں ہیں انسانوں سے بھری

ہوئی ..تم کدھر نکل آئے..''

''کونسی رونقیں..'' اُس کے موٹے ہونٹ جن پر گھاس کے تنکے چپٹے ہوئے تھے طنز سے تھرائے'' ذرا چل پھر کر دیکھو بستیاں ویران ہو چکیں. ہر سُو ایک ہول بھری چُپ کا راج ہے.. ہر سُو سناٹے ہیں اور میں کیسے اتنی مدت کے بعد ادھر آ نکلا، راستہ نہیں بُھولا، ان سناٹوں میں ابھی تک میرے آبائی ویرانے کی مہکیں محفوظ ہیں جنہیں سُونگھتا سُونگھتا میں یہاں پہنچ گیا..اور اس آبائی ویرانے کو اپنی موجودگی سے آباد کر لیا.. یہ میرا گھر ہے..''

اگرچہ وہ ایک آوارہ ہرن تھا، مُجھے اپنے گھر سے بے دخل تو نہیں کر سکتا تھا، میرے پاس باقاعدہ اس کی ملکیت کے تصدیق شدہ سرکاری کاغذات تھے لیکن اُس کمبخت نے جس اعتماد اور گہرے تیقّن سے یہ کہا تھا کہ.. یہ میرا گھر ہے.. مُجھے ایک موہوم سے خدشے سے دوچار کر دیا.

''دیکھو اے بلیک بک بانکے چھبیلے کالے ہرن، تم بے شک میری نرم نرم ذاتی گھاس جی بھر کے چر لو، اپنا پیٹ بھر لو مُجھے کُچھ اعتراض نہ ہو گا لیکن پھر فوری طور پر چلتے پھرتے نظر آؤ..''

''میں نے کہاں چلنا پھرنا ہے'' اُس نے میرا خیال ہے مُجھے گھور کے دیکھا'' میں نے جتنا چلنا تھا چل لیا، جتنا پھرنا تھا پھر لیا.. میں آ گیا ہوں، جہاں سے گیا تھا وہیں واپس آ گیا ہوں.. بلکہ یہ تم ہو جو مداخلتِ بے جا کے مرتکب ہو رہے ہو، میں تو اپنی زمین پر کھڑا ہوں، یہ میرا آبائی چراگاہ ہے..''

ظاہر ہے جیسے انسان فاتر العقل ہوتے ہیں ایسے جانور بھی خبط کا شکار ہوتے ہیں

تو یہ یقیناً ایک خبطی ہرن تھا..

''اچھا خیر..'' میں اب کُچھ حواس باختہ سا ہونے لگا تھا'' کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ یہ زمین تمہاری ملکیت ہے.. کیا تمہارے پاس اس کی ملکیت کے سرکاری کاغذات ہیں..''

''کیا تمہارے پاس ہیں؟''

''سو فیصد.. عدالت سے باقاعدہ تصدیق شدہ..''

''ان کی تصدیق انسانوں نے کی، مُہریں انسانوں نے ثبت کیں، ایسے انسان جنہوں نے ہماری زمین ہتھیا کر ہمیں بے دخل کر کے قبضہ کر لیا.. ہمارے حقوق حلب کر لئے.. ہمیں بے گھر کر دیا..''

''حضور میں پُوچھ رہا تھا کہ کیا تمہارے پاس اس کی ملکیت کا کسی قسم کا کوئی ثبوت ہے؟''

''ہاں میرے پاس ثبوت ہے.. کہ یہ میرا آبائی ویرانہ ہے، میری اپنی سرزمین ہے..''

''کیا ثبوت ہے؟''

''میری طرف دیکھو'' وہ ذرا تن کر کھڑا ہو گیا'' ذرا دیکھو تو سہی کہ میں کیسے وقار اور تمکنت سے اس زمین پر چاروں پاؤں سے کھڑا ہوں.. اور یہ وقار اور تمکنت صرف اُن کے نصیب میں ہوتے ہیں جو اُس زمین کی کوکھ میں سے جنم لینے والے ہوتے ہیں.. میرے چہرے پر جو پُرفخر تمازت ہے وہ دلیل ہے اس حقیقت کی کہ میں اپنے آباؤ اجداد کی دھرتی کا جایا ہوں.. اور پھر اپنے آپ کو دیکھو.. تمہاری شکل پر بے چارگی برستی ہے. کسی کا حق چھین

لینے کی شرمندگی کے پرتو ہیں۔"

"تمہارے پاس ان بلند بانگ دعوؤں کے سوا کوئی گواہی ہے کہ یہ حق تمہارا تھا جو ہم انسانوں نے چھین لیا۔"

"گواہی تو میرے پاس ہے۔" اُس نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

"کس کی گواہی۔؟"

"تمہارے اپنے باپ کی۔ کیا اُس کی گواہی تمہیں مطمئن کر دے گی؟"

یہ ہرن تو واقعی ایک ذہنی مریض تھا جو اس نوعیت کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگا تھا۔ بھلا میرا مرحوم باپ کیسے اُس کی ملکیت کا گواہ ہو سکتا تھا۔

وہ ہرن ایک گہرے استغراق میں چلا گیا۔ کچھ دیر یوں ساکت کھڑا رہا جیسے حنوط کر دیا گیا ہو، پھر دونوں کان باری باری ہلا کر بولا "ذرا آج سے ستر برس پیچھے سفر کر جاؤ، گردشِ ایام پیچھے کی طرف لوٹا دو جب تم بچے تھے، باپ کی گود میں بیٹھ کر کہانیاں سنا کرتے تھے۔ اور وہ دن یاد کرو جب تم نئے گھر میں، اندرون شہر کے ایک تاریک گھر میں سے نہر کے پار ایک جدید بستی کے گھر میں منتقل ہوئے تھے تو ایک شب تمہارے باپ نے کہا تھا کہ میں یہاں مُجرم محسوس کرتا ہوں اور اُس نے ایک کہانی سنائی تھی۔ یہ آج سے تقریباً چالیس برس پیشتر کا قصہ ہے جب میں کاروبار کے سلسلے میں لاہور سے منٹگمری جا رہا تھا۔ ہماری ٹرین لاہور کے قلعہ نما سٹیشن سے نکلی تو میاں میر چھاؤنی کے سٹیشن پر رُک گئی، جہاں سے چند گورے سپاہی غُل مچاتے اپنے لئے مخصوص کردہ کُوپے میں سوار ہو گئے تھے۔ کچھ یاد آیا۔ آگے کی کہانی یاد آئی؟"

ہرن جو کچھ بیان کرر ہا تھا.. میرے باپ کے حوالے سے جو قصہ سنا رہا تھا پہلے تو ذہن کے کینوس پر کوئی تصویر نہ ابھری، ایک کورا کاغذ تھا اور پھر جیسے غیب سے اس پر کچھ لکیریں نمودار ہونے لگیں. وہ لکیریں ایک تصویر میں منتقل ہوئیں اور وہ تصویر حرکت کرنے لگی، زندہ ہوگئی..

میں اپنے باپ کی گود میں سمٹا بیٹھا نہائت اشتیاق سے اُس کی مردانگی سے بھرپور گہری آواز سُن رہا تھا.. ہاں تو ہماری گاڑی کچھ دیر کے لئے میاں میر چھاؤنی کے سٹیشن پر رُکی جہاں سے غُل کرتے چند گورے سپاہی اپنے لئے مخصوص کردہ ڈبے میں سوار ہوگئے. گاڑی ہولے ہولے سٹیشن سے رینگتی ہوئی باہر آئی اور پھر اُس نے رفتار پکڑ لی.. ڈبے میں سوار دیگر مسافروں کی مانند میں بھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا.. ایک وسیع ویرانہ گزرنے لگا جس میں کہیں کہیں خاردار جھاڑیاں اور آک کے پودے اُگے ہوئے تھے.. ڈبے کے اندر دُھول آنے لگی اور میں کھڑکی کا پٹ نیچے گرانے کو تھا جب میں نے ایک عجیب منظر دیکھا، باہر اڑتی دُھول میں سے نہائت پھرتیلے ہرنوں کی ایک ڈار ظاہر ہونے لگی، وہ تعداد میں پندرہ بیس سے کم نہ ہوں گے. ایک غول تھا اور اُنہوں نے ٹرین کے پہلو بہ پہلو عین میرے ڈبے کے سامنے بھاگنا شروع کر دیا.. وہ اپنی پوری توانائی سے قلانچیں بھرتے ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے.. اور جانتے ہو کہ وہ علاقہ کونسا تھا.. یہی جہاں اب ایک وسیع بستی آباد ہو چکی ہے اور جہاں ہمارا یہ نیا گھر ہے.. یہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر جنگلی ہرنوں کی ایک ڈار ٹرین کے ساتھ بھاگتی جا رہی تھی.. میرا خیال ہے کہ وہ ٹرین کی گڑگڑاہٹ کی دہشت میں آگئے تھے اور حواس باختہ ہو کر اس کے ساتھ بھاگنے لگے تھے.. اُن کا خیال

تھا کہ ہم تیز دوڑ کر اس ہولناک شے سے آگے نکل جائیں گے، فرار ہو جائیں گے۔
رفتار مزید تیز ہوئی تو وہ یکدم پیچھے رہنے لگے اور پھر ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے، اس بلا کو دیکھ
لگے جو اُن کی ذاتی زندگی میں دندناتی دھول اڑاتی گزر رہی تھی۔۔ یہاں جہاں آج ہمارا گا
ہے، یہاں ویرانے ہوا کرتے تھے اور ہرنوں کی ڈاریں ہوا کرتی تھیں۔۔ میں اسی لئے
محسوس کرتا ہوں کہ ہم اُن کی چراگاہوں پر قابض ہو گئے ہیں۔۔

ہرن وہاں میری گھاس پر کھڑا مُجھے یوں تک رہا تھا جیسے وہ میری یادداشت کے
دھندلکوں میں ظاہر ہوتی ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگتی ہرنوں کی وہ ڈار دیکھ رہا ہے اور اُن میں
سے اپنے آباؤ اجداد کی شکلیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ دیکھو تو سہی، تم نکالے گئے
یہاں سے اور میں واپس آ گیا ہوں۔ اپنے آبائی ویرانے کی ملکیت پر حق جتانے کے لئے
آ گیا ہوں۔۔

''کیا تمہارے باپ کی گواہی کافی ہے؟''

ہرن کی آنکھوں میں ابھرتے سورج کی زرد کرنیں یوں بجھ رہی تھیں جیسے سنہری
چراگاہوں کے سلسلے پھر سے ظہور میں آ رہے ہوں۔۔

''آج تمہارے شہر ویرانے ہو گئے ہیں، بستیاں سنسان ہو گئی ہیں اور تم لوگ
خوفزدہ چوہوں کی مانند اپنے اپنے گھروں کے پنجروں میں بند ہو چکے ہو۔۔ اپنے اوپر نازل
ہونے والی وبا کے جواز کبھی سائنس کی کتابوں میں تلاش کرتے ہو اور کبھی مقدس صحیفوں کا
سہارا لیتے ہو اور جانتے ہی نہیں کہ تم نے جو ظلم کمایا ہے یہ اُس کا نتیجہ ہے۔۔ اس وبا نے ہماری
بددعاؤں سے جنم لیا ہے۔۔ تم وہاں ہوا کرتے تھے اپنی بستیوں کی فصیلوں کے اندر اور ہم اُن

کے باہر تھے اپنے جنگلوں کی عافیت میں۔ تمہارے اور ہمارے درمیان ویرانوں اور بے آباد دشتوں کے سلسلے تھے جو تمہیں اور ہمیں بھی محفوظ رکھتے تھے۔ پھر تم نے سؤروں کی مانند بچے جننے شروع کر دیے، اتنے بچے جنے کہ بستیوں میں گنجائش نہ رہی اور تم ہمارے جنگلوں اور صحراؤں پر قابض ہو گئے۔ ہمیں اپنی سرزمینوں سے بے دخل کر دیا۔ یوں جب انسانوں اور حیوانوں کے درمیان محفوظ فاصلے نہ رہے، دونوں قریب آ گئے تو ایسی بیماریاں جو صرف حیوانوں میں پائی جاتی تھیں، انسانوں میں منتقل ہونے لگیں، یہ وبا تو ابھی ابتدا ہے۔ تم نے قدرت کے نظام کی خلاف ورزی کی ہے اس لئے تمہاری بساط سمیٹی جا رہی ہے۔ تمہیں اپنے کیے کی سزا مل رہی ہے۔۔''

اس طویل مطعون کرنے والے بھاشن کے بعد جیسے اُسے چین آ گیا ہو، اُس نے پھر تھوتھنی جھکا کر گھاس کو اُس میں سمیٹنا شروع کر دیا کہ اب وہ ثابت کر چکا تھا کہ یہ اُس کی آبائی چراگاہ ہے۔۔ میں مُجرم بنا کھڑا رہا۔۔ اُسے دیکھتا رہا۔۔ یکدم مجھے ایک خیال آیا اور مسکرا دیا۔۔ میرا بڑا پوتا ہمیشہ اصرار کرتا تھا کہ دادا میں نے بیمبی دیکھنا ہے اور جب میں اُسے چڑیا گھر لے گیا ہرن دکھائے تو وہ کہنے لگا، نہیں دادا یہ تو بیمبی نہیں ہیں، وہ تو ہمیشہ آزاد گھومتے ہیں، جنگلوں میں رہتے ہیں۔۔ دراصل وہ امریکہ میں پلا بڑھا تھا جہاں میرا بیٹا سرسبز پہاڑیوں اور جھیلوں کے درمیان واقع ایک آئیوی لیگ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا اور وہاں اُن کے مختصر سے گھر کے آس پاس ہرن اکثر گھوما کرتے تھے، اُن کی کھڑکیوں میں سے جھانکا کرتے تھے تو وہ انہیں کارٹون والے ہرن کے حوالے سے ہمیشہ بیمبی کہا کرتا تھا۔۔

چنانچہ یہ ایک نادر موقع تھا۔۔ ایک ہرن پنجرے میں نہیں اپنی ذاتی چراگاہ میں کیسی

بے پروائی سے گھاس چر رہا تھا.. میں نے دم روک کر بہت آہستگی سے گھر کا آہنی گیٹ کھولا کہ کہیں وہ ٹھٹک کر چلا نہ جائے اور میں نے تقریباً ایک سرگوشی میں پوتے کو پکارا..

میری آواز سن کر وہ نیچے آ گیا.. وہ ناشتے میں مصروف تھا، اُس کے بالائی ہونٹ کے اوپر دودھ کی ہلکی سی تہہ تھی "کیا ہے دادا؟"

"سچ مچ کا یمبی.." میں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے خاموشی کی تلقین کی "باہر گھاس چر رہا ہے.."

اُس کا معصوم چہرہ دمک اٹھا..

ہم دبے پاؤں، دادا پوتا چوروں کی مانند جُھکے جُھکے گیٹ سے باہر آ گئے، باہر گھاس کا وہ قطعہ ویران پڑا تھا..

"یمبی، کہاں ہے دادا؟"

"وہ.. یہیں تھا بیٹے.."

"دادا.." اُس نے بے یقینی سے کہا..

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا بیٹے.. ابھی.. بس یہاں تھا.."

"تو پھر کہاں گیا.."

"پتہ نہیں.." دونوں جانب کی سڑکیں دور دور تک خالی تھیں.." اُس نے مجھ سے باتیں کی تھیں."

"دادا.." اُس نے شکائت اور شرارت سے ملاوٹ بھری آنکھوں سے مُجھے دیکھا.. "یمبی کیسے باتیں کر سکتے ہیں.. ماما ٹھیک ہی کہتی تھیں.."

''وہ کیا کہتی تھیں؟''

''وہ کہتی تھیں..'' اتنا کہنے کے بعد اُسے کوئی سرزنش یاد آ گئی اور اُس نے فوراً کہا
''کچھ بھی نہیں کہتی تھیں..''

وہ مایوس ہو کر جانے لگا تو میں نے اُس کے رخسار تھپک کر شرمندگی سے کہا'' دیکھو
ماما کو نہ بتانا کہ دادا ایک ٹیمبی سے باتیں کرتے رہے ہیں..''

''نہیں دادا..'' وہ مسکرانے لگا ''نہیں بتاؤں گا..''

آزردگی کے یہ موسم طول پکڑتے جاتے ہیں، آخر آپ مزید کتنا تنہا، کتنا آزردہ ہو سکتے ہیں..

ایسا نہیں کہ میں اپنی موت سے خوفزدہ ہوں..

صرف یہ ہے کہ میں وبا کے ان دنوں میں مرنا نہیں چاہتا..وبا کا شکار ہو کر اپنی اولاد کو امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا.

انسان دنیا کی ہر حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے لیکن موت کی حقیقت کو کبھی نہیں، کم از کم اپنی موت کی حقیقت کو کبھی نہیں..شائد موت سے انکار ہی زندگی کی علامت ہے..

وبا کے ان دنوں میں مر جانا بہت غیر مناسب لگتا ہے..

اگر کسی سویر مُجھ میں وہ سب آثار نمودار ہونے لگیں جو دن رات ٹیلی ویژن وغیرہ سے نشر ہوتے ہیں تو کیا میں انہیں خفیہ رکھوں گا یا گھر والوں کو خبر کر دوں گا..میں فیصلہ نہیں کر پا رہا، بہر حال جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ جب پُل آئے گا تو دیکھا جائے گا کہ اسے کیسے پار کرنا ہے..

میں موت سے صرف اس لئے ڈرتا ہوں وبا کے ہاتھوں مرنے سے اس لئے خوف کھاتا ہوں کہ وہ آئیں گے اور مجھے لے جائیں گے۔

پھر کوئی نارمل روٹین کی موت تھوڑی ہوگی کہ چارپائی گھر کے بیچ میں بچھی ہے اور آپ اس پر پڑے ہیں، نتھنوں میں روئی ٹھونسے، منہ کھولے، چہرے پر برسوں سے ٹھیک کی [illegible] میک اپ کیے.. آپ کے گرد آہ و بکا کرتے، رو رو کر نڈھال ہوتے لوگوں کا ہجوم اور بیٹھے ہوئے گلوں میں سے برآمد ہوتی آوازیں کہ.. بیٹے چہرہ دیکھ لو.. دادا کو آخری بار دیکھ لو.. ایسی موت تھوڑی ہوگی..

وبا کی موت کے آداب طے کر دیئے گئے ہیں..

دو چار قریبی لوگ ہوں گے، وہ بھی قبرستان کی چاردیواری کے باہر کھڑے ہوں گے.. گورکن منہ پر ماسک چڑھائے اپنے آپ پر اور قبر پر سینی ٹائزر چھڑک کر آپ کو دفن کر دیں گے.. دادا کو آخری بار دیکھ لو کی آواز نہیں آئے گی کہ بچوں کو ساتھ لانے کی ممانعت ہے.. وہ سب شتابی سے گھر لوٹیں گے، آپ کے کمرے کی ہر شے میں وبا کے جراثیم کلبلاتے ہیں اور ہوا میں کورونا کے وہ گیلے گولے جیسے کسی بلّی نے انہیں اون کے گولے سمجھ کر نوچا ہو، تیرتے پھرتے ہیں.. اس کمرے کو سپرد آتش بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یوں پورا گھر آگ کی لپیٹ میں آ جائے گا.. چنانچہ کسی پرائیویٹ ہسپتال کا ناتجربہ کار عملہ آئے گا اور کمرے میں جراثیم کش ادویات کا دریا بہا کر چلا جائے گا.. دادا گئے..

میں شائد آج بھی وبا کی موت کی تنہائی، بے چارگی اور لاوارث پن کے

تذکرے سے اجتناب کرجاتا اور خواہ مخواہ ایسی موت کی تصویر کشی سے گریز کرتا اگر آج مجھے کینیڈا سے ایک خاتون کا فون نہ آجاتا.. اور یہ جو باہر کے ملکوں سے ان دنوں فون کرتے ہیں ان میں سے اکثر مجھے یُوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی خیر و عافیت کی خبر پر قدرے مایوس ہوتے ہیں. وہ کسی دلدوز، موت بھرے سناریو کی توقع رکھتے ہیں کہ بس دائیں بائیں جنازے اٹھ رہے ہیں اور کل سے میری طبیعت میں بھی کچھ اضمحال سا ہے.. چنانچہ اس جاننے والے نے میری عُمر کا کچھ حساب کتاب نہ رکھا اور ذرا پُرمسرت ہو کر بتایا کہ یہاں بھی وبا تو ہے لیکن شکر ہے کہ زیادہ تر اموات بوڑھے لوگوں کی ہو رہی ہیں، خاص طور پر ایسے بوڑھے لوگ جو حکومت کی جانب سے مہیا کردہ کمروں میں زندگی گزارتے ہیں.. روزانہ کوئی سرکاری اہلکار اُن تک خوراک اور دیگر ضروریات زندگی پہنچا دیتا ہے لیکن وہ اتنی دیکھ بھال نہیں کرسکتا کہ وہیل چیئر پر پڑے کسی بوڑھے کے آلودہ ہو چکے کپڑے تبدیل کروا دے یا کسی بڑھیا کے فُضلے میں لتھڑے ہوئے بدن کو پانی سے صاف کردے.. اُس نے فون پر گفتگو کرتے ہوئے ایک عجیب الم ناک صورت حال کا تذکرہ کیا.. اٹاوہ کے نواح میں ایک نسبتاً فراخ اور جنگل بھرے پُرفضا علاقے میں اُس کا گھر ہے. جس کی کھڑکیوں میں سے کچھ فاصلے پر واقع بُوڑھوں کی، نہائت ثروت مند بُوڑھوں کی ایک پُرآسائش پناہ گاہ دکھائی دیتی ہے جو کسی فائیو سٹار ہوٹل سے کم نہیں.. اُس کا کہنا تھا کہ وہ ہمیشہ ان بوڑھوں کی زندگی پر رشک کرتا تھا جو بے پناہ سہولتوں میں اپنے آخری ایام بسر کرتے تھے اور پھر کورونا نازل ہو گیا.. پچھلے چند روز سے اُس کے گھر کی کھڑکیوں میں سے ایک عجیب منظر دکھائی دینے لگا ہے.. اُس نے دیکھا کہ صُبح سویرے اس شاندار عمارت کے قریب لوگ جمع ہوتے ہیں، وہ

اس کے اندر نہیں جاتے، باہر کھڑے کسی اشارے کے منتظر رہتے ہیں، ایک معیّنہ وقت پہ پناہ گاہ کے عملے کے چند ارکان باہر آتے ہیں اور اُن میں سے کچھ لوگ ہجوم سے الگ ہو کر اُن میں سے کسی ایک اہلکار کی رہنمائی میں عمارت کی کسی خاص کھڑکی کی جانب چلے جاتے ہیں اور وہ کھڑکی کے شیشے کے ساتھ چہرہ لگا کر اندر جھانکتے ہیں.. صرف پانچ منٹ جھانکنے کی اجازت ہے..

دراصل ان دنوں ہر روز اس پناہ گاہ کے اندر تین چار اموات ہو جاتی ہیں.. ان کے لواحقین کو اطلاع کر دی جاتی ہے کہ آپ کل صُبح اتنے بجے یہاں پہنچ جائیں.. آپ کو پناہ گاہ کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہوگی کہ یہ ایک حفاظتی اقدام ہے.. البتہ ہمارے عملے کے لوگ باہر آ کر آپ کو اُس کھڑکی تک لے جائیں گے جس کے اندر آپ کے عزیز کی لاش پڑی ہوگی.. کھڑکی کے پردے کُھلے ہوں گے اور چہرہ بھی آپ کے لئے کُھلا ہوگا.. صرف پانچ منٹ دیکھنے کی اجازت ہوگی.. اُنہیں اُن کی وصیت کے مطابق ہمارا تربیت یافتہ عملہ یا تو دفن کر دے گا یا پھر سُپردِ آتش کر دینے کا بندوبست کر دے گا.. اول تو تدفین وغیرہ کے کُل اخراجات موصوف کے پیکیج میں ہی شامل ہوتے ہیں لیکن اضافی اخراجات کی صُورت میں آپ کو ادائیگی کرنا ہوگی جس کی تفصیل روانہ کر دی جائے گی۔

---

یہ ہرگز کوئی ایسی صورت حال نہیں کہ تصوّر کو ایک ربڑ کی مانند کھینچا جائے تبھی یہ امکان موجود ہو جاتے.. چونکہ یہاں بھی کورونا سے مرنے والے کے کمرے میں داخل ہونے سے گریز کیا جاتا ہے تو کیا وہ بھی اس کھڑکی میں سے جھانک کر میری آخری جھلک

دیکھیں گے... اُنہیں بتایا جائے گا کہ دادا گئے..

چونکہ اسے پینا ڈیمک قرار دیا گیا ہے، یہ وبا پوری دنیا میں پھیل چکی ہے چنانچہ جو کچھ دنیا کے دوسرے خطوں میں ہو رہا ہے وہ یہاں بھی ممکن ہے.. میں ایک پرائیویٹ شخص ہوں، اپنے کمرے میں بھی کسی غیر شخص کی موجودگی تا دیر برداشت نہیں کر سکتا.. چاہے اخراجات میری معاشی حالت سے تجاوز کر جائیں، میں نہ ہی مُلک میں اور نہ ہی مُلک سے باہر کسی ہوٹل میں رہائش کے دوران اپنے کمرے میں کسی کو شریک کر سکتا ہوں، تو میرے لئے یہ خیال سوہان رُوح بنتا جا رہا ہے کہ ان دنوں موت کے امکان میں یہ خدشہ بہر طور موجود ہے کہ میرے برابر میں کسی اور کو لٹا دیا جائے.. دائیں بائیں اجنبی لوگ میری تنہائی میں مُخل ہو جائیں..

اس خدشے کو تقویت اُس رپورٹ نے دی ہے جو بار بار ٹیلی ویژن پر دکھائی جا رہی ہے کہ نیویارک میں وبا کے شکار لوگوں کو اجتماعی قبروں میں دفن کیا جا رہا ہے، پہلو بہ پہلو لٹایا جا رہا ہے. یعنی اُن کے تابوتوں کو نہائت سلیقے سے آپس میں یوں جوڑا جا رہا ہے کہ ان کے درمیان جگہ کا قطعی ضیاع نہ ہو.. ایک طویل مستطیل خندق کی چوڑائی بس اتنی ہی ہے کہ اُس میں ایک نارمل تابوت فِٹ ہو جائے.. تابوتوں کو دفن کرنے کے لئے کندھا وغیرہ نہیں دیا جاتا بلکہ اُنہیں ایک کرین سے اٹھا کر نہائت احتیاط سے پہلے سے رکھ دیئے گئے تابوتوں کے پہلو سے جوڑ دیا جاتا ہے.. اس اجتماعی قبر کی طوالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اگر حُسنِ ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو تقریباً تیس چالیس افراد کو آسانی سے دفن کیا جا سکتا ہے.. اور اس تدفین کے موقع پر کوئی نزدیکی رشتے دار یا دوست وغیرہ موجود نہیں

صرف ایک کرین ہے جو شائد سوگوار ہے.. یہ تمام تابوت ایسے لاوارث بوڑھے بوڑھیوں کے ہیں جن کے لئے عام قبرستانوں میں جگہ کم پڑ گئی ہے.

مجھے بہر طور کچھ طمانیت تو ہے کہ میں خیر سے اتنا لاوارث بھی نہیں ہوں لیکن وبا کی لحہ بہ لحہ بدلتی صورت حال سے کچھ بعید بھی نہیں کہ آئندہ چند ہفتوں میں اموات کی شرح یکدم ایک تیر کی مانند بلند ہو جائے اور اس شہر میں قبرستانوں میں گنجائش ختم ہو جائے اور اگر میں تب شکار ہو گیا تو مجھے بھی مجبوراً ایک اجتماعی قبر کے سپرد کر دیا جائے..

اجتماعی قبر میں پرائیویسی تو بالکل نہیں ہوتی..

آج میری کھڑکی کے باہر جو کھیل تماشے والی منڈیر ہے اُس پر سویرے سویرے دو تین کوے آ براجمان ہوئے..کوؤں کے مزاج میں برداشت کی از حد کمی ہے، وہ کسی اور پرندے خاص طور پر خوش شکل اور خوش رنگ پرندے کو اپنے علاقے میں دیکھ لیں تو وہ اُس کا پیچھا کرتے ہیں، چونچیں مار مار کر ادھ موا کر دیتے ہیں یا ہلاک بھی کر دیتے ہیں..

ویسے کوؤں کا منڈیر پر آ بیٹھنا اچھا شگون نہیں ہے. روائت ہے کہ جس گھر کی منڈیر پر کوا بولے وہاں مہمان کی آمد ہوتی ہے..اور ان دنوں تو گھر سے کوئی نکلتا ہی نہیں تو مہمان موت کے سوا اور کون ہو سکتا ہے.

تو میرے منڈیرے نہ بول، جا کا گا، کا گا جا

مجھے ان دنوں مہمان درکار نہیں، جا کسی اور منڈیر پر بول کا گا..

اگر چہ کوے سارے ہی نحس ہوتے ہیں لیکن یہ جو میری منڈیر پر آ بیٹھے تھے ان کی منحوس شکلوں سے تو لگتا تھا کہ یہ نہ صرف سب تن ماس ہی نہیں دو آنکھیں بھی کھا جائیں گے...

دھوپ اتری تو وہ مایوس ہو کر چلے گئے.

ایک درویش نے کہا تھا کہ تنہائی میں ہی پیغمبری اترتی ہے.

مجھے ڈر سا لگا رہتا ہے..

ہر شے کا حساب کتاب ہو سکتا ہے..

تنہائی کا کوئی حساب نہیں ہوتا..

ایک خاص حد تک تنہائی کے شب و روز کا حساب رہتا ہے اور پھر کچھ حساب نہیں رہتا.. شب و روز کے شمار کے پیمانے معطل ہو جاتے ہیں، جیسے مکمل تنہائی کی قید کاٹنے والے انسان کو جب رہائی نصیب ہوتی ہے تو وہ تعین نہیں کر سکتا کہ کیا میں ایک برس قید تنہائی میں رہا یا مجھے سو برس ہو گئے ہیں..

جب کبھی اگر کبھی میری اور اس شہر کی اور کرۂ ارض کی اکثر بستیوں کی تنہائی اختتام کو پہنچی تو ہماری ذہنی حالت بھی اُس قیدی سے جُدا نہیں ہو گی..

ویسے اس کے آثار ہویدا ہو رہے ہیں..

مُجھے خدشہ ہے کہ اگر حالات پرانے وقتوں کی مانند معمول پر آ گئے تو میں شائد انسانی رفاقت کے قابل نہیں رہوں گا.. مُجھے بھولتا جاتا ہے کہ دوستوں سے کیسے ملا جاتا ہے، ملاقات کا آغاز کس نوعیت کی گفتگو سے کیا جاتا ہے اور پھر ایک ڈھارس بندھتی ہے کہ وہ بھی

تو اسی ذہنی کیفیت سے دوچار ہوں گے.. عین ممکن ہے کہ ہم دیر تک چپ بیٹھے رہیں اور پھر ایک دوسرے کی خاموش رفاقت سے اکتا کر پھر سے بخوشی اپنے کمرے کی تنہائی میں لوٹ جائیں. اپنے دروازے کے ہینڈل، ایش ٹرے، میز، صوفے وغیرہ کی رفاقت میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیں اور اُن سے باتیں کرنے لگیں..

جی ہاں آپ اپنے دروازے کے ہینڈل کے ساتھ نہائت مدلل گفتگو کر سکتے ہیں، اُسے گھماتے ہوئے اُس کی حیات کی میکانکی پیچیدگیوں سے آگاہ ہو سکتے ہیں.. ایش ٹرے کو غور سے دیکھتے جائیے تو آپ نے عمر بھر اُس میں جتنے بھی سگریٹ بجھائے ہیں اُن کا دھواں اٹھتا ہوا نظر آنے لگے گا اور آپ یہ نہیں پوچھیں گے کہ یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے.. ایش ٹرے سے اٹھتا ہے اور کہاں سے اٹھتا ہے.. اور آپ کی میز تو ایک کائنات ہے جس پر آپ کے ہاتھوں کی لکیریں نقش ہیں اور ہر لکیر میں آپ کی حیات کے شب و روز محفوظ ہیں.. وہ محبت نامہ بھی پوشیدہ ہے جو آپ نے اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں اُسے لکھا تھا.. بلکہ آج تک اس میز پر بیٹھ کر جو کچھ بھی آپ نے تحریر کیا ہے اُس کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں اس کی سطح پر لوح محفوظ ہو چکی ہیں.. چنانچہ آپ اس میز سے بلند آواز میں گفتگو نہیں کر سکتے، یہ آپ کی رازدان ہے اس لئے صرف سرگوشیاں اور احتیاط کہ کوئی دروازے کے ساتھ کان لگا کر سُن تو نہیں رہا.. لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے، بہت کام..

یہ ٹیلی ویژن بھی ایک وبا سے کم تو نہیں اور اس پر نمودار ہونے والی وباؤں کا بھی کچھ حساب نہیں..

آخر یہ علماء کرام ہر چینل پر وبا کے ماہرین اور ڈاکٹر حضرات کے پہلو بہ پہلو بیٹھے رہتے ہیں، ان کا وبا کی روک تھام اور سد باب سے کیا تعلق ہے.. سوائے اس کے کہ پہلے سے ہی ڈرے ہوئے عوام الناس کو عذابوں سے ڈراتے دھمکاتے ہیں کہ یہ وبا تو ہم ہمارے گناہوں کی پاداش میں مسلط کی گئی ہے.. چلئے ہم سب مسلمان تو گناہگار ٹھہرے لیکن یہی وبا یورپ اور امریکہ میں کیوں تباہ کاریاں مچا رہی ہے.. نہائت شرعی دلائل کے ساتھ ثابت کیا جاتا ہے کہ نماز کے لئے مسجد جانا فرض ہے اور گھر میں نماز جائز نہیں.. بلکہ دیکھا گیا کہ عوام الناس حکومت کی پابندیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دین کی سربلندی کی خاطر ڈیوٹی پر مامور پولیس پر حملہ آور ہو رہے ہیں جو انہیں اس مذہبی فریضے کو مسجد میں ہی سرانجام دینے سے روک رہے ہیں.. ان کا بھی قصور نہیں کہ ان کا کاروبار بھی تو ٹھپ ہو گیا ہے اور دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ اگر درزیوں کی دکانیں کُھل سکتی ہیں تو مسجدیں کیوں نہیں کُھل سکتیں.. انہیں کچھ غرض نہیں کہ اگر حرم شریف، مسجد نبویؐ اور مسجد اقصیٰ وبا سے بچاؤ کے لیے بند کر دیے گئے ہیں تو اُن کے محلے کی مسجد کیوں بند نہیں ہو سکتی!

کیا میرا ذہنی فتور حد سے نہیں بڑھ گیا.. مُجھے حوصلہ کرنا چاہیے، قدرے تحمل سے کام لینا چاہیے ورنہ کسی روز گریباں چاک کر کے ویرانے میں نکل جاؤں گا..

اور ویرانہ بھی تو گھر سے باہر قدم رکھتے ہی شروع ہو جاتا ہے.

کیا وبا کے یہ دن موت سے پہلے مرنے کے دن ہیں...

شائد یہ موت کو خوش آمدید کہنے کی گھریلو پریکٹس ہے جو ہم تنہا کر دیے گئے ہیں تا کہ تب دشواری پیش نہ آئے اور آپ جان جائیں کہ جان کیسے دینی ہے کے قواعد و ضوابط سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہوں.

ویسے تو موت سے پہلے مر جانا مجذوبوں کی ایک ایسی خواہش ہے جس پر وہ جب چاہیں عمل پیرا ہو سکتے ہیں، جیسے عطاؔر نے ایک فقیر کو طعنہ دیا تھا کہ جیسے تو مرے گا ویسے میں بھی مر جاؤں گا اور فقیر اُس کے سامنے چادر مُنہ پر ڈال مر گیا تھا..تو کیا وہ صرف طبعی موت مرا تھا یا یہ محض ایک دکھاوا تھا عطاؔر کو راہ راست پر لانے کے لئے..فقیر مر گیا تو اُسی لمحے عطاؔر دنیادار اور دکاندار بھی مر گیا اور دنیا ترک کر کے پرندوں کے جہان میں چلا گیا..اور پھر کبھی واپس نہ آیا..

زندگی شب بھر کا ایک ایسا خواب ہے جو پلکوں کی ایک جھپک سے تمام ہو جاتا ہے..

مجھے پچھلی حیات میں تو ایسے خیال کبھی نہ آئے تھے، نہ میں نے کبھی سوچا کہ موت
سے پہلے مرجانا کیا ہوتا ہے کہ تب سوچ یہی تھی کہ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا.. جینے کا مزہ
کب کا رخصت ہو چکا اور کچھ بعید نہیں کہ وہ اب کی بار ایسا گیا ہے، ایسا گیا ہے کہ لوٹ کر
آنے والا نہیں.. شاہ حسین کے اندر بھی تمام مجذوبوں کی مانند موت سے پہلے مرجانے کی
خواہش ابھرتی رہتی تھی لیکن بلا کسی خوف اور ہول کے جو کہ میرے دل میں ہیں. ایسے خوف
اور شک کے سنپولئے صرف میرے ایسے ڈرپوک شخص کی سکڑتی شریانوں میں تیرتے
پھرتے ہیں.. شاہ حسین کے لئے تو موت دائمی بہار کی ایک کونپل تھی جسے وہ آس، امید اور
وصل کے پانیوں سے سینچتا رہتا تھا تاکہ یہ ایک شجر ہو جائے اور وہ فنا کے سائے تلے پناہ لے
کر اپنے اس خواب کی تکمیل کر سکے.. وہ مادھو کو تلقین کرتا تھا کہ.. اگر تم حیاتی کی تلاش میں ہو
تو اپنی موت سے پہلے مرجاؤ..

رب کا فقیر حسین جولاہا یہی کہتا جاتا تھا کہ اس سے پیشتر کہ موت تمہیں آلے، تم
اس دنیا کو چھوڑ جاؤ..

اور ہم جیسے لوگ.. ہم مُردوں کی زندگی بسر کرتے ہیں اگرچہ ہم زندہ ہیں تو موت
سے پہلے مرجانا کیا ہم ایسے دنیادار منافقوں کے لئے بھی ممکن ہے. اس انتقال کے لئے یوں
تو وبا کے یہ موسم بھی نہائت سازگار ہیں..

ویسے ان مجذوبوں کا بھی کچھ دین ایمان نہیں.. شاہ حسین اپنی موت سے پہلے مر
جانے کا تمنائی ہے اور بلھے شاہ کہتا ہے کہ اُساں مرنا ناہیں گور پیا کوئی ہور.. یہ لوگ ہمیں گمراہ
کرتے ہیں جب کہ حقیقت میں دونوں ہی فنا کے راستے کے مسافر ہیں. ایک حیات کی

تلاش میں موت میں اتر جانے کی تلقین کرتا ہے اور دوسرے کا کہنا ہے کہ وہ تو پہلے ہی لوگوں کی نظروں میں مر چکا ہے اور وہ جس بلھے شاہ کو دفن کر رہے ہیں وہ نہیں، کوئی اور ہے۔

وہ کوئی اور کون ہے..

وہ میں بھی ہوں اور تم بھی ہو..

ویسے کبھی غور کیجئے وبا کے ان دنوں میں جو بھی چند چہرے نظر آتے ہیں، سیر کرتے ہوئے، ہمسائے یا نزدیکی عزیز اُن سب کے چہروں میں سے وبا کی سرنج نے خون نچوڑ لیا ہے.. اُن کی شکلوں پر متوقع موت کی سیاہ چمگادڑیں اتر رہی ہیں، اُن کے چہروں پر بھی یہی فکر مندیاں ہیں کہ کیا بہ وقت ضرورت مُجھے ایک عدد وینٹی لیٹر کی سہولت نصیب ہو جائے گی یا میں بھی بے سانس مارا جاؤں گا.. ایک مرے پڑے لاوارث فقیر کی مانند کسی بے نام گڑھے میں دبا دیا جاؤں گا اور اُس گڑھے میں میرے سوا اور کون کون ڈھیر ہوگا، ایسے لوگ جنہیں میں نے زندگی بھر اپنے سے کمتر اور حقیر جانا، اُنہیں قریب نہ آنے دیا کہ مُجھے اُن سے بُو آتی تھی یا پھر ایسے لوگ جنہوں نے زندگی بھر مجھے کمتر اور حقیر جانا اور اُنہیں مجھ سے مشک آتی تھی.. موت سب کو برابر کر دے گی، موت سب سے بڑی منصف ہے، جس کے ترازو میں حقیر فقیر شاہ اور امیر کبیر برابر میں تلتے ہیں اور فقیر کا پلڑا ہمیشہ جھکتا جاتا ہے جیسے وہ اپنے خالق کے سامنے جھکتا جاتا تھا..

تو جتنے بھی چہرے آس پاس نظر آتے ہیں اُن سب کے چہروں پر موت کی سیاہ مُہر ویزے کے طور پر ثبت ہو چکی ہے، کشتی آئے گی اور سب کو پار لے جائے گی اور وہاں عطار کا فقیر، شاہ حسین اور بلھے شاہ پہلے سے منتظر ہوں گے..

آج میں نے زندگی میں (شائد) پہلی بار غیر استری شدہ کپڑے پہنے ہیں..
واشنگ مشین کے ساتھ استری کی سہولت تو نہیں ہے اور ملازمہ اپنے گھر میں بیٹھی ہے..اور
آج یہ بھی انکشاف ہوا کہ غریب لوگ عام طور پر اس لئے بھی غریب دکھائی دیتے ہیں کہ ان
کے کپڑے استری شدہ نہیں ہوتے، سلوٹوں سے بھرے ہوتے ہیں..میں نے اپنے سراپے
کو آئینے میں دیکھا تو میں بھی خاصا غریب لگ رہا تھا..وبا نے سب فرق مٹا دیئے ہیں..

پرندہ پَر جھاڑ رہا ہے..

جھاڑ نہیں رہا، جھڑ رہے ہیں..

جھڑ نہیں رہے. نوچے جا رہے ہیں..

اور اُس کے پَر کون نوچ رہا ہے..

وہ جو سب سے بڑا پرندہ ہے..

اس پرندے کا خالق پرندہ ہے..

جب ہر سُو تاریکی تھی اور ایک دُھند پانیوں پر معلق تھی..

تب بڑے پرندے کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی تھی اور وہ پھڑ پھڑاہٹ کلام کرتی تھی کہ..ہو جا..

اور تب سب پرندے جو آج تک اڑے..

جو آئندہ زمانوں میں اڑیں گے، ظہور میں آ گئے..

لیکن وہ اب اپنے ہی تخلیق کردہ پرندوں کے پَر..

کیوں نوچ رہا ہے؟

ایک ایک کر کے نوچتا چلا جا رہا ہے..

کیا یہ نافرمان ہو گئے

وہ مبتلا ہوئے اس زعم میں کہ وہ..

ہمیشہ اڑیں گے..اڑتے ہی رہیں گے

اور یہ اُڑان اُن کے وجود میں ہے، ودیعت کردہ تو نہیں..

اُس وجود میں یہ اڑان اُنہوں نے اپنی دریافت سے..

اور تحقیق سے بھری ہے

پرندہ پَر جھاڑ رہا ہے..

جھاڑ نہیں رہا، جھڑ رہے ہیں..

جھڑ نہیں رہے، نوچے جا رہے ہیں..

پرندہ نہیں..انسان ہے..

انسان کو پَر لگ گئے تھے..

اُسے زعم ہو چلا تھا کہ وہ پہنچنے والا ہے..

سب سے بڑے پرندے کی سطح پر..

اُس کی برابری کرنے ہی والا ہے..

وہ خود سب سے بڑا پرندہ ہونے ہی والا ہے..

تو اُسے اُس کے زعم سے گرانے کا فیصلہ ہو گیا..

اُس کی اوقات بتانے کا فیصلہ ہو گیا..
اس لئے اُس کے پر نوچے جا رہے تھے..
ایک ایک کر کے نوچے جا رہے تھے..
اُس کے بنائے گئے ہوائی جہاز کھلونے کر دیئے گئے..
جہاں کہیں تھے اُنہیں حنوط کر دیا گیا..
ہلاکتوں کے سامانوں سے آراستہ سب بحری بیڑے..
جنگی جہاز، ایئر کرافٹ کیریئر سب ناکارہ کر دیئے گئے.
جن کا سمندروں پر راج تھا، کاغذ کی کشتیوں سے بھی حقیر ہو گئے..
آبدوزیں جن کے بطن سے دور مار میزائل چھوٹتے تھے..
اُنہیں زنگ لگ گیا..
وہ سمندروں کی تہوں میں گندے چیتھڑوں کی مانند پڑی تھیں..
ہائیڈروجن اور ایٹم بموں میں بُھس بھر دیا گیا..
ہلاکتوں کے جتنے سامان ایجاد کیے گئے..
وبا کے سامنے سسک رہے تھے، پُھس ہو گئے تھے.
تکبّر اور رعونت کی غلاظت گندی نالیوں میں بہنے لگی..
اور بڑا پرندہ اپنی کائنات پر سایہ کیے مسکراتا تھا..
آزادی کا مجسمہ اوندھے مُنہ گر چکا تھا..
اُس کی مشعل وبا کے پانیوں نے گُل کر دی تھی..

وہ شیر جو کبھی سمندروں پر راج کرتا تھا..

صرف ایک وینٹی لیٹر کے لئے ترستا دم توڑ رہا ہے..

بُرج الخلیفہ کا بُرج الٹ گیا تھا..

یہاں تک کہ اُس کا، بڑے پرندے کا گھر بھی ویران پڑا تھا..

اُس کے رکھوالے اپنی جان بچانے کی خاطر..

بڑے پرندے کے گھر کو بھی تیاگ گئے تھے..

رعونت اور امارت کے مارے ہوئے اُسے ویران کر گئے تھے.

انسان کو پَر لگ گئے تھے..

دنیا کے سرکس میں وہ ایک مسخرہ ہو چکا تھا..

تکبر کے بانسوں کے سہارے اپنا قد اونچا کر کے..

سمجھتا تھا کہ وہ آسمان تک پہنچ گیا ہے..

وبا کی دیمک نے ان بانسوں کو کھوکھلا کر دیا اور وہ..

دھڑام سے زمین پر آ گرا تھا..

مٹی کا تھا، دنیا کے مٹّی کے گھوڑے پر سوار تھا..

ہر ایک کو روندتا پھرتا تھا..

سوار بھی مٹّی، گھوڑا بھی ماٹی..

پھر بھی اس مٹّی پر اکڑ کے چلتا تھا..

عزت دینے والے نے اُسے ذلت دینے کا فیصلہ کر لیا تھا..

انسان کو یکدم اتنے پر نہ لگے کہ وہ انسان خوابیدہ ہوا..
جب بیدار ہوا تو پرندہ تھا..
نہیں نہیں.. اس عمل میں صدیاں صرف ہوئیں..
ہر نئی دریافت پر اُسے ایک پَر لگ گیا..
ہر مہلک ہتھیار کی ایجاد نے اُسے ایک اور پَر لگا دیا
دنیاوی تکبّر کی ہر سیڑھی پر پَر لگتے گئے..
اور تب جا کر وہ پرندہ ہوا..
اونچی اڑانیں کرنے لگا..
اڑانیں بھرتا بڑے پرندے کے گھونسلے میں ہاتھ ڈالنے لگا..
تب ذلت عطا کرنے کا فیصلہ ہوا..
تب اُس کا پہلا پَر جھڑا..
اُس کی اڑان کو خفیف سا جھٹکا لگا تو اُسے حیرت نے آ لیا..
یہ پَر تو میں نے خود تخلیق کیے ہیں..
تو ان میں سے ایک پَر نے کیسے میرا ساتھ چھوڑ دیا..
پھر ایک اور پَر جھڑا.. اُسے یقین نہ آیا..
زعم میں مبتلا کہ یہ تو ایک اتفاق ہے.
اور وہ نہیں جانتا تھا کہ پَر جھڑ نہیں رہے..
نوچے جا رہے ہیں..

پھر پَر جھڑتے چلے گئے..

نوچے گئے. جیسے حلال شدہ چکن کے پَر..

ایک ایک کر کے نوچے جاتے ہیں..

چکن کیا جانے اُس کے پَر کون نوچ رہا ہے..

یہاں تک کہ آخری پَر نوچا جاتا ہے تو وہ ایک ننگا لوتھڑا ہو جاتا ہے..

ایسے انسان ہو گیا..

اور آخری پَر تکبّر اور رعونت کا سنہری پَر تھا..

جب وہ نوچا گیا تو..

پرندہ جو کہ انسان تھا.. رفعتوں سے گرا..

پاتال کی جانب گھومتا، بے اختیارا، بے چارہ گرتا گیا..

ماٹی کا سوار ماٹی کے گھوڑے سے گرا..

اور ماٹی پر آ گرا..

کیا اس کے نوچے ہوئے بال و پَر پھر سے اُگ آئیں گے..

اگر اُگ آئے تو کیا وہ پھر سے وہی پرندہ ہو جائے گا..

یا اس کی ہیئت اور خصلت تبدیل ہو جائے گی..

اپنے نئے بال و پَر پر نازاں نہ ہو گا..

پھر کبھی زمین پر اکڑ کر نہ چلے گا..

نہ پرواز کو اپنی جاگیر سمجھے گا، بلکہ ایک ودیعت جانے گا..

یہ سب تو بڑے پرندے کی صوابدید پر منحصر ہے..

کہ وہ اس نُچے ہوئے پرندے کو دوبارہ بال و پر سے آراستہ کرتا ہے..

یا آراستہ نہیں کرتا..

اس نافرمان پرندے کی جگہ ایک اور پرندے کو اپنا جانشین بنا دے..

ایک اور.. نئے آدم کو اتار دے..

جس کے بیٹے زمین پر اکڑ کر نہ چلیں..

تکبر کے بانسوں کے سہارے اپنا قد اونچا نہ کریں..

ممکن ہے نئے آدم کے بیٹوں کی شکل جُدا ہو..

خصلت مختلف ہو..

اور وہ زمین پر پھیل جائیں..

وبا سے ویران شدہ دنیا کو پھر سے آباد کریں

ایک نئی دنیا کے معمار ہو جائیں..

ایسی نئی دنیا جہاں..

حیوان، چرند پرند اپنے اپنے خطّوں میں بے خطر زندگی کریں..

اور کوئی انسان اُنہیں اُن کی چراگاہوں سے بے دخل نہ کرے..

زمین سانس لیتی رہے..

ابھی کچھ التوا ہے..

ابھی فیصلہ نہیں ہوا کہ کیا اسی لوتھڑے کو..

نئے بال و پر بخش دیے جائیں اور..

اسے پھر سے دنیا کی حاکمیت سپرد کر دی جائے..

یا..ایک نئے آدم کو اتارا جائے..

ہمارے سیکٹر کے مختلف حصّوں میں چھوٹے چھوٹے کُچھ ترتیب شدہ پارک ہیں جن کے گرد ویران دکھائی دیتی رہائش گاہوں میں میرے ایسے بُوڑھے بھی قید تنہائی کاٹ رہے ہیں..

میں ایک ایسے ہی پارک میں روزانہ ایک چھوٹی سی بچّی کو دیکھتا ہوں جس کا پھیکا پڑچکا فراک اور بن دھوئے بھورے بال اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ وہ یہاں گھریلو کام کاج کرنے والیوں میں سے کسی ایک کی بیٹی ہے.

یہ بچّی پورے پارک میں تنہا ہوتی ہے، دوڑتی پھرتی ہے، کبھی اس جُھولے پر جُھولتی ہے اور کبھی اُس سلائڈ پر چڑھ کر پھسلتی ہوئی نیچے آتی ہے اور اُس کے فلاکت زدہ چہرے پر مسرت کی پُھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں کہ اُسے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آتا.. شائد پچھلے زمانوں میں وہ دیگر بچوں کی موجودگی میں اس پارک میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرسکتی تھی.. اگرچہ داخلے پر ایک سرکاری اعلان آویزاں ہے کہ لاک ڈاؤن کے دوران اس پارک میں داخل ہونا منع ہے.. لیکن صُبح سویرے کون دیکھتا ہے. میں اُس بچّی کے لئے

بے حد خوش ہوں.

اُس کی خواہش تو ہو گی کہ یہ لاک ڈاؤن ہمیشہ جاری رہے اور وہ ہمیشہ اس پارک میں اکیلی بھاگتی دوڑتی پھرے، کوئی اور بچہ نہ ہو..

حالات ایسے ہیں کہ بچّی کی یہ خواہش پوری ہونے کا امکان تو ہے.

میرا جی چاہتا ہے کہ میں کبھی پارک میں داخل ہو کر اُسے جُھولے پر بٹھا کر خوب جُھلاؤں.. بلند ترین سلائڈ پر لے جا کر اُسے ہولے سے دھکیل دوں.. لیکن شائد وہ مُجھے دیکھ کر ڈر جائے، خوفزدہ ہو کر بھاگ جائے اس لئے میں اُس پارک سے اجتناب کرتا ہوا کسی اور جانب نکل جاتا ہوں.

میں اُس بچی کے لئے بہت خوش ہوں..

کورونا اگر ایک بچی کی خوشی کا باعث بن سکتا ہے تو بے شک یہ کچھ مدت کے لئے ٹھہر جائے.

سولزے نتن کے ناول ''آئیون ڈینیسووچ کی زندگی میں ایک دن'' کا مرکزی کردار آئیون ڈینیسووچ بیگار کیمپ میں اپنی سزا پُوری کرنے کے بعد جب پہلی بار باہر کی دنیا میں آتا ہے تو وہ ایک سپورٹس سٹیڈیم میں کچھ کھلاڑیوں کو اس کا چکر لگاتے بھاگتے ہوئے دیکھتا ہے تو کسی سے پوچھتا ہے کہ ان کو کس جُرم میں یہ سزا دی گئی ہے اور جب اُسے بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنی مرضی سے یُوں بھاگ رہے ہیں تو وہ ماننے سے انکار کر دیتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی بھی شخص اپنی خواہش سے بھاگنے کی مشقت کرے، انہوں نے یقیناً کوئی نہ کوئی جُرم تو کیا ہوگا..

آئیون ڈینیسووچ کو برس ہا برس سے بیگار کیمپ میں روزانہ صُبح سویرے چالیس چکر کیمپ کے گرد بھاگتے ہوئے پورے کرنے کی سزا ملتی تھی..

تو وقت گزرنے سے میں بھی یہی محسوس کرنے لگا ہوں کہ یہ ہر صُبح جو میں سیر کے لئے نکل جاتا ہوں تو اس میں میری مرضی کی بجائے مجبوری شامل ہوتی ہے، میں ایک سزا کے طور پر چلتا چلا جاتا ہوں.. میں کورونا کے بیگار کیمپ کا ایک ایسا قیدی ہوں جو نہیں جانتا کہ وہ کتنی مدت کے لئے قید کیا گیا ہے، رہائی کبھی ہوگی بھی یا نہیں..

اور جانے کس جُرم کی سزا پائی ہے یاد نہیں..

یکدم میرے سامنے کوئی شے دَھپ سے آ گری..

پروں کی ایک پوٹلی تھی جو میرے سامنے آ گری.

ایک کبوتر تھا سرمئی رنگت کا، دیسی قسم کا عام سا کبوتر، اُن ہزاروں کبوتروں ایسا جو شہر کے مقابر کے صحنوں میں دانہ چُگتے نظر آتے ہیں جو بہت فربہ ہو چکے ہوتے ہیں..

پروں کی پوٹلی خون آلود ہو چکی تھی.

اُس کا سر اتنی بلندی سے گرنے کی وجہ سے پھٹ گیا تھا اور تارکول میں اُس کے خون کے چند قطرے جذب ہو رہے تھے..

وہ پھڑ پھڑایا بھی نہیں، گرا اور مر گیا..

ناتواں سا کبوتر تھا..

فاختہ پلٹ گئی تھی..

تھکاوٹوں سے بوجھل گرتی سنبھلتی بالآخر وبا کی مانند پھیلے پانیوں کے اُس مقام تک پہنچ ہی گئی تھی جہاں سے اُس نے اڑان بھری تھی..

فاختہ پلٹ گئی تھی..

تا کہ واپس جا کر کشتی والے سے معافی کی خواستگار ہو جائے، غٹرغوں کرتی گردن جھکا کر دردناک آوازیں نکالتی اُس سے درخواست کرے مُجھے ذرا دم لینے دے، میرے پروں کی جڑیں خون آلود ہو چکی ہوں، ذرا یہ مندمل ہو جائیں، شب بھر آرام کرلوں تو کل سویر پھر سے اڑ جاؤں گی اور تب تک نہیں لوٹوں گی جب تک خشکی کی خبر نہ لے کر آؤں، خشکی کی کوئی نشانی چونچ میں بھر کر تیرے قدموں میں نہ رکھ دوں، یہ میرا وعدہ ہے..

فاختہ پلٹ گئی تھی..

تب اُس نے نیچے دیکھا..

وبا کے پانیوں کی چادر کرۂ ارض کے کونوں تک بدستور بچھی ہوئی تھی.

اور نیچے، کشتی جہاں تھی..

وہاں موجود نہ تھی..

فاختہ کا دل۔اور وہ کتنا ہوتا ہے، ایک پپوٹے جتنا بھی نہیں، وہ دھڑکا نہیں، تھم گیا، صدمے، دہشت اور حیرت سے تھم گیا..

بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کشتی وہاں موجود نہ ہو..

کشتی ڈوب نہیں سکتی..وہ کوئی معمولی کشتی تو نہ تھی، اُس میں حیوانوں اور انسانوں کی آخری نسلیں سوار تھیں جن سے اس کرۂ ارض کو دوبارہ آباد کیا جانا تھا..دنیا کی ہر کشتی ڈوب سکتی ہے لیکن وہ کشتی جو سب سے بڑے پرندے کے اذن سے تخلیق ہوئی، نہیں ڈوب سکتی..

مہتاب، آفتاب سب ستارے سیّارے وبا کے ان بے انت پانیوں میں ڈوب سکتے تھے لیکن نہیں..یہ کشتی نہیں..

صدمے، دہشت اور حیرت سے اُس کا پپوٹا دل تھم گیا اور وہ ایک پل کے لئے معلّق ہو گئی ہوا میں جیسے حنوط ہو گئی۔وہ پل بیتا تو وہ حنوطگی اور معلّقی یکدم معطّل ہوئی اور وہ پروں کی نہیں پتھروں کی ایک پوٹلی کی مانند نیچے گرنے لگی..اتنی شدت رفتاری سے گرنے لگی کہ اُس کے سارے پر اور روئیں ہوا کی شدتوں سے اُس کے بدن سے اکھڑنے لگے..وہ جان گئی کہ جب اس آسمانی بلندی سے شرلاٹوں اور پھڑپھڑاہٹوں بھری تیزیوں کی شدت سے وہ بالآخر پانیوں کی سطح پر گرے گی تو جیسے پانیوں پر نہیں ایک چٹان پر گرے گی اور نابود ہو جائے گی۔

فاختہ پانیوں کی سطح کو اپنی مہین اور مرتی ہوئی آنکھوں سے قریب آتا دیکھ رہی تھی

جب غیب سے ایک لمحہ اترا، اُس کے تھم چکے پپوٹا دل میں ایک لرزش نے جنم لیا اور اُس میں سے ایک کونپل پھوٹی، اُس کونپل میں خوش خبریاں بھیجی گئی تھیں، نہ ہی وہ کشتی ڈوب سکتی ہے اور نہ ہی وہ موت سے دوچار ہو سکتی ہے کہ بڑے کشتی والے نے اپنے چپوؤں سے لوحِ ازل پر اس کشتی کی سلامتی اور فاختہ کی حیات رقم کر دی تھی..

وہ پانیوں پر پاش پاش ہونے سے روک دی گئی..

حیات کی حدت نے بال و پر میں واپسی اختیار کی.. اُس کا تھما ہوا دل، پپوٹا دل اس شدت سے دھڑکا جیسے سورج پھٹ گیا ہو اور وہ جو بے اختیار ہو چکی تھی، با اختیار ہوئی، پھڑپھڑائی اور بُلند ہوتی گئی..

فاختہ پھر سے اڑان میں تھی..

کون جانے وہ کتنے پہر، کتنے زمانے، وقت کے کتنے پیمانوں میں اڑی.. جہاں کبھی صحرا تھے، بیابان تھے اور بستیاں تھیں، پہاڑ تھے جو میخوں سے ٹھونک دیئے گئے تھے اور جنگلوں کی گھناوٹ کے اندھیرے تھے وہ اُن پر اڑی اگرچہ وہ سب روپوش ہو چکے تھے، آب پوش ہو چکے تھے..

کتنے زمانے، وقت کے کتنے پیمانے بیت گئے جب اُس نے نیچے پانیوں کا ایک ایسا منظر دیکھا کہ اُس کا پپوٹا دل پھر سے تھمنے کو آیا..

پانیوں پر کچھ تیرتا تھا، ہچکولے لیتا تیرتا تھا.. سطحِ آب پر بڑی مچھلیوں کے سفید کوہان نہ تھے، کچھ اور تھا..

تابوت تھے..

وبا کے پانیوں میں سینکڑوں تابوت، کُچھ کے ڈھکن سرکے ہوئے، کُچھ سراسر مقفل.. ڈولتے پھرتے تھے.. گمان ہوتا تھا کہ ان میں مدفون لوگ اُن میں سے باہر نکلنے کی جستجو کر رہے ہیں.. لیکن جو تابوت کُھلے تھے، جن کے ڈھکن لہروں کے تھپیڑوں سے سرک گئے تھے اُن کے اندر نہ تو مُردے تھے نہ کوئی ڈھانچے تھے، نہ کفن تھے، سوائے اندھیرے کے اُن کے اندر کُچھ نہ تھا..

سمندروں میں ان گنت تابوت ہچکولے کھاتے کسی نامعلوم منزل کی جانب رواں تھے..

کیا قبروں نے بھی اپنے مُردے اگل دیئے ہیں..

اگر سیلاب کے پانی بستی کے تندوروں میں سے بھی ابلنے لگے تھے تو وہ قبروں میں سے بھی تو پُھوٹ نکلے ہوں گے اور اُن کے مکینوں کو بہا لے گئے ہوں گے.. لیکن ان تابوتوں میں جو مُردے تھے وہ کہاں گئے.. وہاں اندھیروں کے سوا کچھ نہ تھا.. ایسا تو ممکن نہیں کہ اس وبا کے خوف سے مُردے بھی فرار ہو گئے ہوں. اور اب اُن کے تابوت پانیوں کی چادر پر کاغذ کی کشتیوں کی مانند گمشدہ گمشدہ ڈولتے پھرتے ہوں..

فاختہ اس تابوتی منظر کو دیکھ کر ہراساں ہو سکتی تھی پر وہ نہ ہوئی.. بلکہ موت کے ان گھپ اندھیروں میں بھی اُسے اُمید کی کرن کے دیئے جلتے ہوئے دکھائی دیئے.. اگر وہاں موت ہے تو وہاں زندگی بھی ہے.. وہ پہلے سے کہیں زیادہ پُراعتماد ہو گئی بلکہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے اُس کی اڑان حیات کی کُل سکت ابھی تک اُس کے بدن میں محفوظ تھی، یوں وہ نئی نویلی اور ہلکی پھلکی ہو گئی.. اُس کے پروں کی خون آلود جڑیں مندمل ہو گئیں، وہ ایک

نئی فاختہ ہوگئی..

وہ پُھرتیلی، ہشاش بشاش نئے بال و پر کے ساتھ اڑان میں تھی..

میری یہ اڑان اب تبھی اختتام کو پہنچے گی جب وبا کے پانیوں میں سے ابھرتا خشکی کا کوئی ٹکڑا مُجھے دکھائی دے گا اور میں لپک کر اُس کی جانب گرتی چلی جاؤں گی..

میں کسی نہ کسی منڈیر پر اتروں گی..

یہ میرا وعدہ ہے..

میرے پوتے پوتیاں جو وبا کے اولین دنوں میں، قرنطینہ کے آغاز میں مُجھ سے سماجی دُوری اختیار کر کے نہائت پُر مسرت ہو کر کُہنیوں کی حرکت سے مُجھے ہیلو دادا کرتے تھے اور لب سکیڑ کر مُجھے دُوری کے بوسے بھیجتے تھے، اس روٹین سے بیزار ہوتے جا رہے ہیں..

میں اُنہیں موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا کہ اُن کے لئے میری محبت بھی میکانکی ہوتی جاتی ہے..تنہائی اس محبت کو گُھن کی مانند چاٹتی جاتی ہے..

کھڑکی کے پار میری منڈیر پر آج یکسر نئے اداکار نمودار ہوئے ہیں..

سٹیج پر داخل ہونے والے یہ نووارد نہائت شوخ رنگوں والے طوطے سے لگتے ہیں.. اگرچہ عام طوطوں کی نسبت ان کی جسامت قدرے مختصر ہے اور پُھد کتے بہت ہیں..ان میں سے دو تو پیلے پھٹک ہیں، بہت ہی زرد رنگت کے ہیں جیسے انہیں زردے کی دیگ میں دم دیا گیا ہو..ایک بہت ہی نیلا ہے جیسے کسی رنگ ساز کے تسلے میں ڈبو کر نکالا گیا ہو..اور چوتھا، گہرے سبز رنگ کا ہے جیسے پچھلے جنم میں گھاس کا ٹڈا رہا ہو اور اس جنم میں طوطا ہو گیا ہو..ان چاروں کی چہل پہل بہت ہے..منڈیر پر یوں پُھد کتے پھرتے ہیں جیسے مختلف رنگوں کی اون کے گولے لڑھک رہے ہوں..

میں نے اپنے سیل فون سے ان کی تصویریں اتار کر اپنے ایک واقف کار کو وہاٹس اپ کیں جس کا مشغلہ برڈ واچنگ ہے اور وہ پرندوں کے بارے میں تفصیلی معلومات رکھتا ہے..اُس نے بتایا کہ یہ تو سون چڑیاں ہیں اور صرف اپریل کے انہی دنوں میں دکھائی دیتی ہیں..لیکن وہ قدرے حیرت زدہ تھا کہ سون چڑیاں آبادیوں کا رُخ کم کرتی ہیں تو یہ

کدھر سے آ گئیں..

اب یہ آبادیاں تو کہاں ہیں، جنگل ہو گئے اس لئے آ گئیں، میں نے سوچا..

وہ پل بھر کے لئے چین سے نہ بیٹھتی تھیں، منڈیر پر اُچھلتی کُودتی پھرتی تھیں.. جیسے شوخ و شنگ بالڑیاں ہوں.. جوانی میں قدم رکھتی لڑکیاں بالیاں ہوں جنہیں چین ہی نہیں آتا.. لڑکیوں کو بھی تو ہمارے ہاں چڑیاں کہا جاتا ہے..

ساڈھا چڑیاں دا چنبہ وے، بابل اساں اُڈ جاناں اے..

گلی میں سے کوئی موٹر سائیکل گزرا اور وہ اُس کی پھٹ پھٹ کے شور سے خوفزدہ ہو کر یکدم اڑ گئیں..

چار سون چڑیاں، دو پیلی پھٹک، ایک نیلو نیل اور ایک ہری بھری.. اُون کے رنگین گولے لُڑھکے اور اڑ گئے..

میں اُن کے دوبارہ نمودار ہونے کی آس رکھتا ہوں.. وہ پھر آئیں اور میرے جی کو جو تنہائی سے بجھتا جاتا ہے اُس میں اپنے رنگ بھر کے پھر سے روشن کر دیں..

ہمارے ہاں جب آفتیں حد سے گزرنے لگیں، وباؤں، بیماریوں اور موسموں کی شدت پر اختیار نہ رہے تو عبادتوں کی جانب رجحان زیادہ ہو جاتا ہے.. لوگ چھتوں پر چڑھ کر اذانیں دینے لگتے ہیں، اُسے متوجہ کرتے ہیں جس نے ان بلاؤں کو نازل کیا ہے.

گھروں میں محبوس لوگ اپنے آپ کو نارمل رکھنے کے لئے حالت انکار میں چلے جاتے ہیں، اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ صورت حال اتنی تشویش ناک نہیں جتنی کہ حکومت اور میڈیا بیان کر رہا ہے.. یہ صریحاً مبالغہ ہے لیکن جس شب اُن کے آس پاس اذانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو اُن کی ساری طفل تسلیاں اور اپنے آپ کو ایک مغالطے میں مبتلا رکھنے کی کاوشیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں.. وہ سہم جاتے ہیں.. مزید ڈر جاتے ہیں.. اذانیں دینے والے خود سہمے ہوتے ہیں اور اس کا کتھارسس کرنے کے لئے اذانوں کا سہارا لیتے ہیں.

میں ذاتی طور پر کوئی ایسا عبادت گزار شخص نہیں ہوں، صرف فجر کی نماز باقاعدگی سے ادا کرتا ہوں اور اس کے سوا غفلت اختیار کرتا ہوں.. اور نہ ہی مجھے روحانیت سے کچھ

لگاؤ ہے.. لیکن اس کے باوجود پچھلے زمانوں میں داتا گنج بخشؒ کے مزار کی پائینتی کے قریب سرنگوں ہو کر اپنے آپ میں گم ہو جانے کا عمل مُجھے ایک گہرے سکون سے آشنا کرتا تھا.. میں اس کی کوئی بھی توجیہہ پیش کرنے سے قاصر ہوں، قبر پرستی میرا شعار نہیں اور نہ ہی میں مرقدوں پر دیئے جلانے میں یقین رکھتا ہوں.. لیکن داتا صاحب کا معاملہ مختلف لگتا ہے.. عین ممکن ہے کہ یہ ''کشف المحجوب'' کے ایسے نامعلوم اثرات ہوں جو میری رُوح پر بے خبری میں مرتب ہو گئے..

بہر حال میں نے طے کر رکھا ہے کہ میں نے کسی روز خفیہ طور پر داتا صاحب کے ہاں جانا ہے، اُن کی پائینتی سے لگ کر اپنے آپ میں گم ہونا ہے اور خاص طور پر اُن کے صحن میں اترتے کبوتروں کو دانہ کھلانا ہے.. میں اس یاترا کو اس لئے مخفی رکھوں گا کہ کہیں میرے بچے مُجھ پر پابندی عائد نہ کر دیں.. کسی روز سیر کے لئے نکلوں گا تو اُدھر کا رُخ کر لوں گا.. واپسی میں دیر ہو گئی تو کہہ دوں گا کہ چلتے چلتے مجھے چکر آنے لگے تھے، ورٹیگو کی شکائت ہو گئی تھی، طبیعت سنبھلنے تک کسی پارک کے بنچ پر بیٹھا رہا..

میرا خیال ہے یہ ایک قابلِ عمل منصوبہ ہے..

کیا اس وبا کے خوف سے لوگ مذہب کے قریب آ گئے ہیں یا معاملہ اس کے برعکس ہے..وہ شک شبہے میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں..

بہت کم لوگ خصوصی طور پر مسجدوں میں جا کر نماز ادا کیا کرتے تھے لیکن ان دنوں سب لوگ مسجدوں میں ہی نماز ادا کرنے پر کیوں اصرار کرتے ہیں..کیا وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ بندھن ڈھیلا پڑتا جاتا ہے اور اس احساس جُرم کو پوشیدہ رکھنے کے لئے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ بدستور مذہب سے جُڑے ہوئے ہیں، مسجدوں میں جا کر نماز پڑھنا اپنی ترجیح اول سمجھتے ہیں..وہ حسب معمول اپنے اپنے گھروں میں عبادت کرنے پر مائل کیوں نہیں ہو رہے..کیا تنہائی میں کورونا کی آفت سے سہم کر کسی شک کا شکار ہو جاتے ہیں، اُنہیں اپنی مذہبی استقامت کے لئے گواہی درکار ہے، جو مسجدوں میں ہی میسر آ سکتی ہے.

کورونا کے ورود سے پیشتر بہت سے احتیاط پرست لوگ کوئی ایسی شے استعمال کرنا حرام سمجھتے تھے چاہے وہ کوئی عام دوا ہی کیوں نہ ہو جس میں الکوحل کی آمیزش کا خدشہ ہو.. بلکہ میرا مشاہدہ ہے کہ وہ خریداری کرتے وقت کسی ایسے ٹوتھ پیسٹ، یوڈی کولون یا

آفٹر شیو لوشن کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے جس میں الکوحل کی ملاوٹ کا شائبہ بھی ہو..

اس وبا کی آمد نے مذہبی معیار بھی بدل دیئے ہیں..

سینی ٹائزر خریدتے ہوئے لوگ کیمسٹ سے پُوچھتے ہیں کہ حضرت اس میں خالص الکوحل ہے ناں..ٹیلیویژن پر ان دنوں سینی ٹائزرز کے اشتہارات کی بھرمار ہے جن میں جلی حروف میں درج ہوتا ہے کہ ہماری پروڈکٹ سو فیصد خالص الکوحل سے تیار کی جاتی ہے..اور سب مُفتی سب مشائخ وغیرہ مُنہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہیں، نہ کوئی دھمکی نہ کوئی فتوئی کہ آخر اس حرام شے کی برسرِ عام تبلیغ کیوں کی جا رہی ہے..بلکہ آپ خبروں میں دیکھتے ہیں کہ یہی حضرات نہائت اہتمام سے وزیرِاعظم ہاؤس میں داخل ہوتے ہوئے اس سے ''وضو'' کر رہے ہوتے ہیں یہاں تک کہ مسجدوں کے باہر بھی سینی ٹائزرز کی بوتلیں سجی ہوتی ہیں اور نمازی حضرات اس سے مستفید ہوتے ہیں، نہ کوئی اعتراض نہ کوئی شرعی دھمکی..کورونا پر جو تحقیق جاری ہے اگر اس نتیجے پر پہنچے کہ الکوحل کورونا کو دور رکھنے کے لئے معاون ثابت ہوسکتا ہے تو کُچھ بعید نہیں کہ باقاعدگی سے نہ سہی کبھی کبھار یہ حضرات گھونٹ دو گھونٹ پی ہی لیں، یا جس قدر ملے اور صُبح کو توبہ کر لیں..

جس روز میری منڈیر پر اون کے رنگین گولوں کی مانند سُرخ، سبز اور زرد رنگوں کی سون چڑیاں اتریں، اپنی رنگین پُھدک پُھدک موجودگی سے میرے پژمردہ قلب پر رنگین پچکاریاں چھوڑ کر مُجھے خوش کر دیا.. اُسی روز جب وہ یکدم منڈیر خالی کر گئیں اور میرے دل میں ملال بھر گئیں تو مُجھے اُس ملال میں ایک انوکھا خیال آنے لگا..

میرے بچپن میں ''برڈ مین آف ال کٹراز'' نامی فلم کا بہت چرچا ہوا تھا.. جس میں برٹ لنکاسٹر نے مرکزی کردار ادا کیا تھا.. سمندروں میں گھرے عقوبت خانے ال کٹراز میں جسے ''راک'' بھی کہا جاتا تھا ایک شخص کسی گھناؤنے جُرم کی پاداش میں ایک کوٹھڑی میں بند عُمر قید کاٹ رہا ہے.. کوٹھڑی کی چھت کے قریب ایک چوکور روشن دان ہے اور ایک روز جانے کدھر سے ایک پرندہ آ کر اُس میں بیٹھ جاتا ہے، کُچھ دیر چہکتا ہے، پُھدکتا ہے اور چلا جاتا ہے. وہ روزانہ آنے لگتا ہے اور قیدی اُسے ڈبل روٹی کے ٹکڑے کھلا کر اتنا مانوس کر لیتا ہے کہ وہ بے خطر اُس کی ہتھیلی پر آ بیٹھتا ہے.. وہ جاننا چاہتا ہے کہ یہ پرندہ کونسی نسل کا ہے، اس کا نام کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے. وہ جیل کے حکام سے رابطہ کر کے پرندوں کے بارے میں

کتابیں حاصل کرتا ہے اور اُن کے مطالعہ میں مگن ہو جاتا ہے.. پرندوں کے بارے میں اُس کی تحقیق اور مطالعہ اس درجۂ کمال تک پہنچتا ہے کہ ملک کے مشہور جرائد میں اُس کے تحقیقی مضامین شائع ہونے لگتے ہیں اور اُسے ''برڈ مین آف ال کٹراز'' کے نام سے پکارا جانے لگتا ہے..

سون چڑیوں کی رخصتی کے بعد جب میں ایک گہرے ملال میں تھا تو مجھے یہی انوکھا خیال آیا کہ میری منڈیر پر تو رنگ رنگ کے ہر نوعیت کے پرندے اترتے رہتے ہیں تو کیوں نہ اس جبری تنہائی سے فائدہ اٹھا کر میں بھی پرندوں کی دنیا کو دریافت کروں.. میرے پاس تو اُس قیدی کی نسبت تحقیق اور جانکاری کے بہتر بلکہ معجزہ آفرین وسائل موجود تھے، گوگل کا معجزہ میسر تھا جو میرے آئی پیڈ میں سانس لے رہا تھا، اُس کے پاس میرے ہر سوال کا جواب تھا.. مسلسل تنہائی اور اکتاہٹ کے اندھیروں میں امید اور سرخوشی کا ایک روشن دان نمودار ہو گیا، میں نے پاکستانی پرندوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا..

عین ممکن ہے کہ ایک ایسا وقت آئے کہ میں بھی پُورے ملک میں نہ سہی کم از کم اس کمرے میں ہی سہی ایک برڈ مین کی صُورت اختیار کر لوں... اور کیا جانئے اس دوران دن رات پرندوں کے بارے میں سوچ بچار کرتے ہوئے میرے اپنے پر بھی پُھوٹ نکلیں. میں اس کرۂ ارض کی تنہائی سے فرار ہو کر اڑانیں کرتا کسی اور سیارے پر جا پہنچوں اس آس کے ساتھ کہ وہاں فی الحال کورونا وائرس نہیں پہنچا ہو گا..

اُن پہلے پہلے دنوں میں سویر کی سیر کے دوران مُجھ میں تجسّس تھا، شوق اور دریافت کی جستجو بہت تھی اور میں گھروں کے طرزِ تعمیر، اُن کے گیٹوں کے ڈیزائن، چھتوں کی بناوٹ کو پرکھتا جاتا تھا، ستونوں پر آویزاں ناموں کی تختیاں غور سے پڑھتا جاتا تھا لیکن اب تو کُچھ بھی باقی نہیں رہا، نہ تجسّس ہے اور نہ کُچھ بھی جاننے کی آرزو.. بس ایک بے حسی سی ہے جس نے میرے پورے نظام کو ایک وائرس کی مانند جکڑ لیا ہے، میری آنکھیں نابیناؤں کی مانند اپنے سامنے کے خلاؔ کو گھورتی جاتی ہیں اور میں چلتا جاتا ہوں.. البتہ اگر کسی باڑ میں کوئی پُھول کھل گیا ہو، کوئی بیل میرے دیکھتے دیکھتے کسی دیوار سے لپٹ گئی ہو یا کوئی بہت قدیم شجر نظر آ جائے تو میری خالی آنکھوں میں اُن کی کشش بھر جاتی ہے اور میں ذرا ٹھہر کے اُنہیں دیکھتا ہوں..

البتہ ایک سویر جب میں اپنی بے حسی کی کیفیت میں مبتلا چلتا جاتا تھا تو مُجھے ایک زرد نشیلی مہک کا احساس ہوا جیسے کسی چینی شہزادی کے بدن سے اٹھنے والی حدّت کا ایک زرد خمار ہو.. شرینہہ کا ایک گھنیرا درخت تھا جو وبا کے ان موسموں میں زرد پُھولوں سے اٹا ہوا

تھا. اُس کے نیچے سڑک پر اُس کے کومل کومل پُھول بکھرے ہوئے تھے، وقفوں وقفوں سے اُس کے گھنیرے پن میں سے کوئی پُھول ایک زرد تتلی کی مانند پھڑ پھڑاتا ہوا گھمن گھیریاں کھاتا نیچے آ گرتا.. ہوا اس کی نشیلی مہک کو ہر سُو اڑائے پھرتی تھی..

اگر آپ آج تک شرینہہ کے کسی پُھول کی زرد نشیلی مہک سے آشنا نہیں ہوئے تو کتنے بد قسمت ہیں، آپ تو زرد خمار آور خوشبو کی جادوگری سے بے خبر ہی رہے.. ایسی خوشبو جو بُوڑھے دلوں کو خوشی دیتی ہے، اُنہیں بادشاہ بنا دیتی ہے.. جوان بدنوں میں سرائت کرے تو اُنہیں مُنہ زور کر دیتی ہے..

میاں محمد نے بچھڑ چکے عاشقوں کے چہروں کو سرِ شام شرینہہ کے پھُولوں پر جو زردی اترتی ہے اُس سے تشبیہ دی ہے..

ے وِچھڑ گیاں دی کی اے نشانی
جیویں ڈیگر رنگ شرینہاں

وبا کے دنوں کا ایک اور انعام..

میں روزانہ شرینہہ کی زردی کی چھاؤں تلے سے گزرتا ہوں.. اور جب میں نہ گزروں گا تو اس شرینہہ کو کون دیکھے گا..

مُجھے کسی شب بیدار ہو کر چپکے سے اپنی منڈیر کو دیکھنا ہے.. ہوسکتا ہے رات کی تاریکی میں اُس پر چمگادڑیں بھی اترتی ہوں جن کے بارے میں شنید ہے کہ وہ کورونا وائرس کی مائیں ہیں..

گھر کے باہر ستون پر میرے نام کی جو تختی آویزاں ہے اُس کے کونوں میں ٹھونکے گئے کیل ناقص سیمنٹ کی وجہ سے اکھڑ رہے ہیں.. یہ اُکھڑ رہے ہیں یا اُن کو اکھاڑا جا رہا ہے، میں ایک وہم میں مبتلا ہو گیا.. تختی کی درزوں میں سے چند تنکے جھانک رہے تھے، کسی پرندے نے وہاں گھونسلا بنانے کی کوشش کی تھی، کہیں یہ پرندہ بھی اُس ہرن کی مانند میرے گھر کی زمین پر اپنی ملکیت ثابت کرنے کی خاطر میرے نام کی تختی کو اکھیڑ کر وہاں ایک گھونسلا بنانے کے چکر میں تو نہیں ہے..

یہ بھی بچپن کے قصے ہیں، جب ایچ جی ویلز کے ناول "وار آف دے ورلڈز" پر مبنی ایک فلم دیکھی تھی۔۔کوئی خلائی مخلوق زمین پر نازل ہو کر تباہی مچا دیتی ہے، تاج محل ڈھے رہا ہے، اہرام مصر مسمار ہو رہے ہیں، معبد کھنڈر ہو رہے ہیں، شہر تباہ ہو رہے ہیں وغیرہ۔۔ تباہی اور بربادی کی چڑیلیں تب تو صرف پردہ سکرین پر شائبوں کی صورت میں دکھائی دیتی تھیں لیکن ان دنوں تو وہ کورونا کا روپ دھار کر ہماری آنکھوں کے سامنے اس کرۂ ارض کو تباہ کرنے پر تُل گئی ہیں۔۔یہ دنیا ویران ہو گئی ہے، انسانی بستیوں میں اجاڑ پن اتر آیا ہے۔۔ تاج محل کے گرد پہرے ہیں۔۔کیا پتہ کل کلاں اہرام مصر کو بھی چھینکیں آنے لگیں، اُسے تیز بخار ہو جائے، اُسے سانس لینے میں دشواری ہو اور اُس کا ہر پتھر کورونا کا شکار ہو کر فوت ہو جائے۔۔

ایک اور فلم اسی نوعیت کی "اینڈ آف دے ورلڈ" نام کی نمائش ہوئی تھی جس کے آخری منظر میں پورا نیویارک سنسان پڑا ہے، کوئی ذی روح زندہ نہیں بچا سوائے ایک ایفرو امریکی شخص کے جو ٹائمز سکوئر کی جانب چلا جا رہا ہے۔۔یہ سب سکرین کے شعبدے تھے

جو ہولے ہولے حقیقت کا روپ دھار رہے ہیں.. وائرس بے قابو ہو کر اس شہر کے گلی کوچوں میں راج کر رہا ہے.. ہلاکت کے اعداد و شمار بڑھتے چلے جاتے ہیں تو کیا نیویارک کے اجڑنے کے دن آ گئے ہیں اور اگر پورے شہر میں صرف ایک فرد زندہ بچتا ہے تو وہ کون ہوگا.. کیا ایک گورا ہوگا، ایفرو امریکی یا ہسپانوی ہوگا، کیا پتہ ایک پاکستانی بھی ہو اور اگر کسی کونے کھدرے میں ایک عورت بھی سانس لے رہی تھی تو کیا اُن دونوں کی مخلوط نسل کل کے نیویارک کا چہرہ ہوگا.. تصوّر کیجیے ایک ایسا نیویارک جہاں صرف پاکستانی دندناتے پھریں اور مولانا حضرات عید کا چاند دیکھنے کے لئے ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ پر چڑھ جائیں.. وہ جو محض خواب و خیال تھا، تصوّراتی قصے کہانیاں تھیں، وہ سب ممکنات کی جانب سفر کرتے جاتے ہیں اور وہاں سوال اٹھ رہے ہیں کہ لوٹ مار کب شروع ہوگی، بڑے بڑے سُپر سٹورز پر دھاوا بولنے کے دن لگتا ہے قریب آ رہے ہیں..

لوگ بھوک سے بھی مرنے لگے ہیں، جنوبی امریکہ کے ایک ملک میں لاشیں سڑکوں پر پڑی ہیں، اُنہیں اٹھانے والے اُن کو ہاتھ نہیں لگا رہے.. بوڑھے اپنی وہیل چیئروں پر بیٹھے بیٹھے لڑھک رہے ہیں.. قبرستانوں میں جگہ کم پڑتی جاتی ہے.. ہمارے ہاں بھی بحث شروع ہو گئی ہے کہ اگر وائرس قابو سے باہر ہو گیا تو مرنے والوں کی تدفین کا بندوبست کیا ہوگا.. ہم اپنے مُردے ہندوؤں کی مانند جلانے سے تو رہے کہ اس کے لئے بھی دیسی گھی کے کنستر، صندل کی لکڑی اور لُوبان وغیرہ درکار ہوں گے اور یہ کہاں سے آئیں گے، مہنگا سودا ہے۔

اور جہاں تک مُردے کو کسی خود کار بھٹّی میں جھونک کر اُسے راکھ کر دینے کا سلسلہ

ہے تو ہم نے اس سلسلے میں دور اندیشی نہیں برتی، مردے جلانے کے لئے ایسی بھٹیوں کی تعمیر میں غفلت سے کام لیا گیا.. ورنہ ایک متبادل تو میسّر ہوتا.. اور جہاں تک سپردِ آتش کرنے پر آمادگی کا تعلق ہے تو مجھے یقین ہے کہ اس کی بھی توثیق کر دی جائے گی، اگر الکوحل کو قبول کر لیا گیا ہے تو حالتِ اضطراری کے تحت مردوں کو نذرِ آتش کرنے پر بھی آمادگی ظاہر ہو سکتی ہے..

اور یہ جو پراگندہ خیالات کے ہجوم مُجھے آلودہ کر رہے ہیں، یہ بے سبب نہیں، یہ میرا ذہنی فتور نہیں، جو کُچھ آس پاس ہو رہا ہے اِس فتور نے اُسی سے جنم لیا ہے۔

آج پھر وہاں ایک ہرن تھا..

میں سویر کی جبری سیر سے لوٹتا ہوں تو میرے گھر کے باہر دیوار کے پہلو میں جو گھاس کا قطعہ ہے وہاں آج پھر ایک ہرن تھا.

وہ کوئی ہرن نہ تھا، وہی ہرن تھا..

میں نے اُسے فوراً پہچان لیا تھا کہ وہ کوئی معمولی بکری نما ہرن نہ تھا، باقاعدہ چشم غزال رکھتا تھا، اس پہچان کے سنگ ایک خوف بھی چلا آیا..اُس نے پچھلی مرتبہ اسے اپنی آبائی چراگاہ قرار دے کر اس پر اپنی ملکیت کا حق جتایا تھا..اور جب میں نے اپنے پوتے کو ایک سچ مچ کا بیمبی دکھانے کے لئے بلایا تھا تو وہ غائب ہو گیا تھا..بعد کے دنوں میں ایک خیال میرے اندر جڑیں پکڑنے لگا کہ شائد دماغی فتور کے ان دنوں میں وہ ایک واہمہ ہو،

میں نے اُسے کسی سراب میں دیکھا، اُس سے باتیں کیں جب کہ اُس کا کوئی وجود نہ تھا اور پھر وہ دوبارہ بھی تو دکھائی نہ دیا چنانچہ میں کُچھ بے فکر ہو گیا کہ اگر ہرن ہے ہی نہیں تو میرے گھر پر ملکیت کا حق جتانے والا بھی کوئی نہیں..

اُسے پھر سے اپنے گھاس کے قطعے پر موجود دیکھ کر میں پھر فکر مند ہو گیا. میرا ڈر لوٹ آیا، وہ مُجھے زہر لگا..

اور وہ تنہا نہ تھا..

وہ تو مُجھے آشنا نظروں سے تکتا تھا لیکن اُس کے برابر میں اُسی کے رنگ رُوپ کے دو ہرن بچّے بھی تھے جو میری آمد سے بے خبر نہائت محویت سے گھاس چرتے جاتے تھے ..اس بار سلسلۂ کلام اُس نے شروع کیا، نہائت شکائت بھری آنکھوں سے کہنے لگا "میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا..کہاں تھے؟"

میرا پارہ چڑھ گیا اور میں نے آواز بلند کرتے ہوئے کہا "تمہیں اس سے کیا کہ میں کہاں تھا. تم ہوتے کون ہو مُجھ سے پُوچھنے والے.."

"آہستہ بولو" اُس نے سرزنش کی "میرے بچّے ٹھٹک جائیں گے"

"یہ.." میں نے لہجے کو دھیما کر لیا "تمہارے بچّے ہیں"

"ہاں.."

"گویا تم ہرن نہیں ہو بلکہ ایک ہرنی ہو"

"اب تم کون ہوتے ہو مُجھ سے پوچھنے والے کہ میں ایک ہرن ہوں یا ہرنی.. میں جو بھی ہوں بچّے میرے ہیں، دیکھتے نہیں ان کی شکلیں مُجھ پر گئی ہیں."

واقعی ان کی آنکھوں میں بھی چشم غزال والی دل کشی ضرور تھی۔

"یہ بڑا ہے۔۔" اُس نے تھوتھنی سے اشارہ کیا "اس کا نام غزال صحرا ہے"

"واہ" میں پکارا تھا "کیا شاعرانہ نام ہے۔۔گویا تمہیں شاعری سے بھی دلچسپی ہے؟"

"نہیں، شاعری کو ہم ہرنوں سے دلچسپی ہے۔۔ہم نہ ہوتے تو تم لوگ اپنے محبوب کے قصیدے کیسے کہتے۔۔آنکھوں کے علاوہ اُس کی چال کی نزاکتیں اور بدن کی لچک کو کس سے تشبیہ دیتے، مجنوں پہ کیا گزری غزالاں سے نہ پوچھتے تو کس سے پوچھتے۔۔اور یہ جو چھوٹا ہے اسے میں اداس جنگل کہتا ہوں۔۔"

"یہ کیسا نام ہے؟"

"ہم ہرنوں کے ایسے ہی نام ہوا کرتے ہیں۔۔یہ نہائت سنجیدہ بچّہ ہے۔۔اس کی آنکھوں میں جنگلوں کی تنہائی اور اداسی بھری ہوئی ہے۔۔اسے جب گھاس چرنے سے فرصت ہوئی تو تمہاری جانب جب آنکھ بھر کے دیکھے گا تو تمہارے اندر بھی تنہائی اور اداسی کی شام اترنے لگے گی۔۔"

مُجھے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ ایسی شاعرانہ گفتگو سے اجتناب کرنا چاہیے ورنہ خواہ مخواہ فری ہو جائے گا بلکہ تیوڑھی چڑھا کرنا گواری کا اظہار کرنا زیادہ مناسب ہوگا تا کہ دل شکستہ ہو کر کبھی دوبارہ ادھر آنے کا ارادہ نہ باندھے۔۔آخر کو میرے گھر پر قابض ہونے کی دھمکی دے چکا ہے۔۔"اور آج تم اپنا پورا خاندان ساتھ لے کر میرے غریب خانے پر کیوں آدھمکے ہو۔۔پچھلی بار تم نے میری گھاس پر مُنہ مار مار کر اُسے گنجا کر دیا تھا، مُشکل سے پھر ہری

ہوئی ہے..اب اگر تم تینوں اس کے بیری ہو گئے تو یہ دوبارہ اُگنے کی نہیں، چلتے پھرتے نظر آؤ..''

شکر ہے اس بار اُس نے یہ نہیں کہا کہ چلتے پھرتے تم نظر آؤ بلکہ کہنے لگا ''انسان واقعی ایک احمق جانور ہے..''

اگر کوئی دوسرا انسان آپ کو احمق کہہ دے تو یقیناً بُرا تو لگتا ہے لیکن اگر ایک آوارہ ساہرن آپ کو احمق اور وہ بھی جانور کہے تو بہت سُبکی محسوس ہوتی ہے..

''دیکھو بُرا ماننے کی ضرورت نہیں..میں نہ صرف تمہارا چہرہ پڑھ سکتا ہوں بلکہ تمہارے مساموں میں سے غصّے اور شرمندگی کا جو پسینہ پُھوٹ رہا ہے اُسے بھی سُونگھ سکتا ہوں کہ ہم ہرن اپنی سونگھنے کی حِس کے زور سے ہی اپنے آپ کو شکار ہونے سے بچاتے ہیں۔احمق تم اس لئے ہو کہ تم قانون فطرت سے نا آشنا ہو..فطرت کے راز داں نہیں ہو.. گھاس تو پھانسی کے تختے پر بھی اُگ آتی ہے..گھاس ہمیشہ اُگ آتی ہے..کیا تم نے کبھی کوئی ایسا چراگاہ دیکھی ہے۔جس تک رسائی صرف حیوانوں کی ہو اور وہ اُس کی گھاس پر ہمہ وقت مُنہ مارتے رہتے ہیں اور یوں وہ چراگاہ گھاس سے عاری ہو جائے..نہیں، گھاس ہمیشہ اتنی ہی گھنی رہتی ہے، کبھی کم نہیں ہوتی..گھاس اور اُسے چرنے والے حیوانوں کے درمیان فطرت کی جانب سے ایک توازن برقرار رہتا ہے..اگر گھاس محض چرنے سے نابود ہو جائے تو وہ چراگاہ نہ رہے ایک چٹیل میدان ہو جائے اور ایسا کبھی نہیں ہوا..یہ صرف انسان ہے جو چراگاہوں کو اجاڑ دیتا ہے، میں ایک مثال دیتا ہوں، نانگا پربت کے دامن میں ہزاروں برسوں سے ایک داستانوی چراگاہ ہوا کرتی تھی جسے ''فیئری میڈوز'' کا نام دیا گیا تھا، جہاں

پریاں اترتی تھیں.. پھر اُس تک رسائی آسان ہوگئی، انسانوں کے غول کے غول آنے لگے۔
اُس کے چراگاہی بدن پر درجنوں ہوٹلوں کے گھاؤ لگا دیے گئے اور اب لوگ وہاں باربی کیو
کی آگ لگا کر اُس کی گھاس کو بھسم کرتے ہیں، چراگاہ کے درمیان میں ایک چٹیل میدان
وجود میں آ گیا ہے جہاں سیّاح حضرات کرکٹ کھیلتے ہیں.. یہاں تک کہ وہاں ایک سٹیڈیم
تعمیر کرنے کی خواہش بھی ہے جس میں ٹونٹی ٹونٹی کے کرکٹ میچ کھیلے جائیں.. یہ تم انسان
کرتے ہو.. ہم حیوان تو نہیں کرتے.. احمق نہیں تو اور کیا ہو..''

''تم یُوں بھاشن دے کر اپنی دانش کی دھاک بٹھانا چاہتے ہو.. تم ہو کیا.. ایک
معمولی سے ہرن.. اور ہر ہرن شکل سے قدرے بیوقوف لگتا ہے.. مُجھے لیکچر دینے کی کوشش
نہ کرو.. مُجھے یہ بتاؤ کہ آج تم اپنے بچّوں کو کس سلسلے میں اپنے ہمراہ لے کر آ گئے ہو..''

''انہیں ان کی آبائی چراگاہ دکھانے.. جیسے تم لوگ کبھی کبھی اپنے بچّوں کو اپنا
آبائی گاؤں دکھانے کے لئے لے جاتے ہو.. ایسے میں بھی انہیں لے کر آ گیا ہوں.. لیکن
ایک فرق کے ساتھ.. تم یہاں نئی آبادیوں کی سہولتوں کی عشرت میں اس قدر گم ہو چکے ہو کہ تم
نے کبھی اپنے آبائی گاؤں واپس نہیں جانا.. جب کہ ہم واپس آ گئے ہیں..''

''ہم نے یہاں جڑیں پکڑ لی ہیں، ہم اکھڑ نہیں سکتے..''

''یہ حرص، ہوس اور سہولت کی جونکیں ہیں جنہیں تم جڑیں سمجھ رہے ہو.. یہاں کی
مٹی تمہیں کبھی قبول نہیں کرے گی، یہ ہماری مٹی ہے جس کی جانب ہم واپس آ رہے ہیں..''

''یہ تمہاری خام خیالی ہے کہ تم پھر سے ہماری ملکیت کی زمینوں پر قبضہ کر لو گے..
تم کیا جانو ہم انسانوں کے پاس کیسے کیسے ہلاکت خیز ہتھیار ہیں جن کے استعمال سے ہم

ہرگز گریز نہ کریں گے..''

مجھے نہیں معلوم کہ ہرن کس طرح ہنستے ہیں مگر یہ ہرن ہنسا اور وہ بھی طنزیہ انداز میں ''تم نے یہ ہتھیار ہمارے لئے نہیں ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کی خاطر جمع کر رکھے ہیں..تم کہاں انہیں چلاؤ گے، اتنے ڈرپوک ہو کہ وبا کے ڈر سے اپنے اپنے گھروں میں چوہوں کی مانند دبکے بیٹھے ہو.. پہلے اس وبا سے نپٹ لو پھر ہماری جانب آنے کا سوچنا، اگر تم زندہ رہے تو..''

میں نے سوچا ایسی دھمکیوں سے کام نہیں چلے گا.. یوں بھی آخر ہم کتنے ہرن ماریں گے. جتنے پرندے واپس آرہے ہیں اُن میں سے کتنے ہلاک کریں گے، مفاہمت سے کام لینا دانش مندی ہوگی ''دیکھو..ہم صلح صفائی سے، کُچھ لو کُچھ دو کے اصول کے تحت یہاں اکٹھے بھی تو رہ سکتے ہیں..''

''نہ..'' وہ صریحاً انکاری ہو گیا ''مجھے خوب معلوم ہے کہ جب بھی یہ وبا تمہارے سر سے ٹلی تم پھر سے ہمارے بیری ہو جاؤ گے، ہماری جان کے درپے ہو جاؤ گے..تمہارے ہی محاورے کے مطابق دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے، تمہاری بظاہر مفاہمت انگیزی پر اعتبار کر کے ہم نے اپنی تھوتھنیاں نہیں جلانی..نہ..''

میں اُسے ایک بھولا بھالا نیم خواندہ سا ہرن سمجھ بیٹھا تھا جیسا کہ ایک ہرن کو ہونا چاہیے لیکن وہ تو ایک گانٹھ کا پکا کائیاں قسم کا ہرن تھا..

اُس کے بچّے بھی عمدہ اخلاقیات سے عاری معلوم پڑتے تھے..مجال ہے اُنہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی میری جانب دیکھا ہو کہ ہم جس شخص کی ذاتی گھاس پر مُنہ مار رہے ہیں

اُسے کم از کم تشکر سے آنکھ بھر کر دیکھ تو لیں..

''دیکھو ہرن.. تم اب براہ کرم اپنے غزالِ صحرا اور اداس جنگل کو لے کر رخصت ہو جاؤ.. مجھے سیر کے بعد تھکاوٹ ہو جاتی ہے، میں اندر جا کر آرام کرنا چاہتا ہوں..''

اس بار میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ مسکرایا ہے.. اُس کے دانت یوں نمایاں ہوئے جیسے بکرے کی سری کے دانت عیاں ہوتے ہیں.. ''رخصت تو تم نے ہونا ہے، آج نہ سہی کل.. ہم آج یہاں قیام کرنے نہیں آئے بلکہ صرف یہ دیکھنے آئے ہیں کہ تم لوگ ہماری جائیداد کی مناسب دیکھ بھال کر رہے ہو یا نہیں.. ہم پھر آئیں گے..''

''کب..'' میں نے قدرے طنزیہ انداز میں پُوچھا..

''جب تم چلے جاؤ گے..''

''میں نے کہاں جانا ہے.. میں کہیں نہیں جا رہا..''

''جانا تو ہے.. یہ وائرس دراصل اس دنیا میں تم جیسے جتنے بھی زائد المیعاد اور ناکارہ ہو چکے بوڑھوں کی افراط ہے اُس میں خاطر خواہ کمی کرنے کے لئے نازل ہوا ہے.. تم نہ صرف اس دنیا پر بلکہ اپنے بال بچّوں پر بھی ایک بوجھ ہو، سو تمہاری رخصتی کے دن آپہنچے.. تو میں نہیں چاہتا کہ ان آخری دنوں میں تمہیں یہاں سے بے دخل کروں.. تم کہہ سکتے ہو کہ مجھ میں انسان دوستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے..''

ہرن کے اس بیان پر میں تو لرز گیا..

مُجھے یہ بھی احساس ہوا کہ ہرن نے ماسک نہیں پہنا ہوا.. کُچھ پتہ نہیں یہ کورونا زدہ ہو.. یہ کمبخت مُجھ سے قریب ہو ہو کر جو سانس لے رہا ہے تو صرف اس لئے کہ کورونا کے

جراثیم میرے بوڑھے بدن میں سرائت کر جائیں، چنانچہ میں ٹھٹک کر ذرا پرے ہو گیا.. اپنے اور اُس کے درمیان سماجی فاصلہ قائم کر لیا..

میں اب خاصا ہراساں ہو چکا تھا.. اندر جانے سے پیشتر میں نے کہا "اچھا اے بظاہر بھولے بھالے اور نادان لگتے ہرن مُجھے صرف یہ بتا دو کہ آخر میرا قصور کیا ہے.. تم نے قابض ہونے کے لئے آخر میرے گھر کا ہی انتخاب کیوں کر لیا ہے.. اس سیکٹر میں میرے گھر کے سوا بھی تو سینکڑوں رہائش گاہیں ہیں اور میں نے آج تک اُن کے باہر گھاس پر مُنہ مارتا اور اُس رہائش گاہ کے مالک کو دھمکاتا کوئی اور ہرن نہیں دیکھا.."

"وہ ہوتے ہیں.. لیکن وہ تمہیں نظر نہیں آتے.."

"اگر تم نظر آ سکتے ہو تو مُجھے وہ بھی نظر آ سکتے ہیں، وہ ہوتے ہی نہیں.."

"وہ ہوتے ہیں.. ہر اُس گھر کے باہر ہوتے ہیں جو اُن کی چراگاہوں کو ملیامیٹ کر کے تعمیر کیا گیا ہے.. تم انہیں دیکھ نہیں سکتے.."

"کیسے نہیں دیکھ سکتا" میں نے بھنّا کر کہا..

"جیسے اگر یہاں کا کوئی باسی ادھر آ نکلے تو وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتا.. وہ تمہیں یوں باتیں کرتا دیکھ کر یہی سمجھے گا تم ایک اور ایسے بوڑھے ہو جو حواس کھو بیٹھا ہے.. مسلسل تنہائی، بے اعتنائی، موت کے خوف اور غیر یقینی مستقبل کے ہراس سے تمہارا دماغ بھی چل گیا ہے.. تم ایسے بوڑھے ان دنوں دیواروں سے باتیں کرتے ملتے ہیں.. درختوں کے تنوں سے لپٹ لپٹ کر روتے ہیں اور اُن کے خوابوں میں بھی وینٹی لیٹر آتے ہیں.."

کسی نے بُلند آواز سے مُجھے پکارا.. چونک کر پیچھے دیکھا تو میرے پڑوسی خالد

صاحب ماسک چڑھائے، اپنے مقفل گیٹ کی اوٹ میں سے ہاتھ ہلا کر مجھے متوجہ کر رہے تھے ''خیریت ہے ناں؟'' اُنہوں نے پُوچھا..

''جی جی..وہ..''

''کس سے باتیں کر رہے ہیں حضور..''

''وہ..میری گھاس کو یہ بدتمیز ہرن اجاڑ رہا تھا، اسے سرزنش کر رہا تھا..کمبخت آج اپنے بچّے بھی ساتھ لے کر آ گیا ہے..''

اُنہوں نے حیرت کے مارے اپنا ماسک اتار کر پہلے گھاس کے قطعے کی جانب دیکھا اور پھر مجھے دیکھا..''کونسا ہرن؟''

''یہ والا کمبخت..''میں نے ادھر اشارہ کیا..

ہرن وہاں موجود نہ تھا..بچّے بھی نہ تھے..

میں کتنے والہانہ اشتیاق سے، بے قابو ہوتی بے صبری سے، کھڑکی کے پار منڈیر کی سٹیج پر اُن کی آمد کا منتظر رہتا ہوں.. سیر کے سوا میری مقفل حیات میں یہی تو ایک لمحہ ہوتا ہے جو مُجھے ہمکنار کرتا ہے گہری مسرّت اور انبساط سے جب پہلا پرندہ اُس پر آ بیٹھتا ہے. بلکہ میں ایک جواری کی مانند اپنے ساتھ ہی پہلی دید کا جوا کھیلتا ہوں کہ آج مُجھے گمان ہے کہ سب سے پہلے ایک کٹھ بڑھئی منڈیر پر اترے گا اور اگر اُس کی بجائے کوئی فضول سی بھوری چڑیا نازل ہو جاتی تھی تو میں اپنے آپ سے ہار جاتا تھا..

اپنے آپ سے ہار جاتا تھا..

میں نے چونکہ ایک برڈ مین یا پرندہ ایکسپرٹ ہونے کا سوچ لیا تھا اس لئے اب میں منڈیر پر اترے ہوئے پرندوں کو بہت غور سے دیکھتا تھا. اُن کے عادات و خصائل کا ایک طالب علم کی مانند مشاہدہ کرتا تھا. نیٹ پر پرندوں کے بارے میں جتنی بھی کتابیں پی ڈی ایف کی صُورت میں میسّر تھیں میں اُن کا مطالعہ کرتا رہتا تھا.. میں ابھی اپنی پرندہ تحقیق کے ابتدائی مراحل میں ہوں اس لئے فی الحال تفصیلی جائزہ کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں..

ویسے تو پوری دنیا میں شہر خالی، کوچہ خالی دیکھ کر جنگلی جانور اپنی آماجگاہوں سے نکل کر سڑکوں پر چہل قدمی کر رہے ہیں لیکن اس دوران میامی کے ساحلی شہر میں ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے.. وہاں ہزاروں کوّوں نے یلغار کر دی ہے، دن کے وقت شہر میں چھاؤں کر دی ہے.. وہ نہ صرف ساحلی سڑک ساؤتھ بیچ پر منڈلاتے نظر آتے ہیں بلکہ سمندر کنارے ریت پر اتر کر بھی ٹہلتے نظر آتے ہیں.. وہ اکا دکا راہگیروں کے سروں پر ٹھونگے مارنے سے بھی نہیں جھجکتے.. جانے اتنے ڈھیر سارے کوّے کہاں سے ظاہر ہو گئے ہیں.. انہیں دیکھ کر الفرڈ ہچکاک کی فلم ''دے برڈز'' یاد آنے لگی ہے جس میں پرندوں کے غول کے غول ایک پُرامن قصبے پر اترتے ہیں اور نہ صرف مختلف گھروں کو چونچیں مار مار کر کھوکھلا کر دیتے ہیں بلکہ متعدد لوگوں کو بُری طرح مسخ کر کے ہلاک کر ڈالتے ہیں.

میں اب ایک اور سہم کا شکار ہونے لگا ہوں.. پرندوں کا بھی کُچھ اعتبار نہیں کہ وہ کب اپنی بے ضرر خصلت ترک کر کے خونخوار ہو جائیں.. اُن کی اُسترے کی دھار ایسی چونچیں انسانی بدن کو ادھیڑ ڈالنے کی صلاحیت رکھتی ہیں.. عین ممکن ہے کہ وہ انسانی گوشت نوچنے کے عادی ہو کر آدم خور ہو جائیں. کُچھ پتہ تو نہیں..

یہ جو بُلبلیں منڈیر پر غُل کرتی ہیں، یہ کیوں میری کھڑکی کی جانب تکتی جاتی ہیں، ان کے ارادے اچھے نہیں لگتے.. یہ چڑیاں لگتی بھولی بھالی ہیں لیکن ان کا کیا اعتبار کہ اس لمحے وہ غور کر رہی ہوں کہ کھڑکی کے شیشے کے پیچھے جو بوڑھا نظر آ رہا ہے تو ہم کیسے شیشہ توڑ کر اندر جائیں اور اس کی آنکھیں نوچ لیں.. سون چڑیاں بھی مُجھے مخدوش لگنے لگیں..

کیا یہ محض اتفاق ہے کہ کوّے اب باقاعدگی سے منڈیر پر اترتے رہتے ہیں، کیا

پتہ اُنھیں میامی میں کوؤں کی یلغار کی خبر پہنچ گئی ہو اور وہ بھی اپنا وجود ثابت کرنے کی خاطر میری کھڑکی پر حملہ آور ہونے کی منصوبہ بندی کرر ہے ہوں..

میں اب اپنی مستطیل کھڑکی کے سارے چوکھٹے مضبوطی سے بند کر کے سوتا ہوں، احتیاط بہر طور بہتر ہے.. بے شک یہ محض مسلسل تنہائی اور انقطاع کا شاخسانہ ہے کہ میں اس ذہنی خلفشار میں مبتلا ہو گیا ہوں اور یہ میرے واہمے ہیں، پھر بھی احتیاط کرنے میں تو کچھ حرج نہیں..

بہر طور میں نے طے کر لیا ہے کہ کل صُبح نکلوں گا تو سیر کرنے کے بہانے کسی نہ کسی طرح داتا صاحب کے دربار میں پہنچ جاؤں گا.. کسی کونے کی گمنامی میں روپوش ہو کر اُن سے براہ راست گفتگو کروں گا کہ حضور عجب مصیبت میں مبتلا ہوں، آپ کے فیض کا طالب ہوں، کہتے ہیں کہ آپ کا سایہ اس شہر پر ہے تو کبھی اس شہر پر بھی نظر ڈال لیجئے کہ یہ کس حال میں ہے.. کُچھ آہ وزاری بھی کروں گا تا کہ اُن پر کُچھ تو اثر ہو.. داتا کے کبوتروں کے لئے دانے کی پوٹلی کا بندوبست میں نے کر لیا ہے، وہ اُنہیں ڈالوں گا شائد وہ خوش ہو کر داتا سے میری سفارش کر دیں.. اور مُجھے اس خوف بھری لاچارگی کی تنہائی سے نجات مل جائے، کُچھ سکون عطا ہو جائے..

منڈیر پر پہلا پرندہ اترنے سے پیشتر واپس آ جاؤں گا تا کہ میرے بچوں کو شک نہ ہو کہ میں سیر کی بجائے شہر کی ویرانی کی جانب چلا گیا تھا..

''کبوتر کہاں گئے؟''

''مر گئے مولا..''

''کبوتر.. کیسے مر گئے..''

''جیسے انسان مرتا ہے تڑپ تڑپ کر ایسے کبوتر بھی مرتے ہیں پھڑک پھڑک کر..''

مُجھے وہ ایک کبوتر یاد آ گیا جو دھپ سے میرے سامنے آ گرا تھا اور مر گیا تھا..
داتا صاحب کے دربار سے متّصل سنگ مرمر کا وسیع صحن بھائیں بھائیں کر رہا تھا..
اسے جب دیکھا کبوتروں سے بھرے دیکھا، اب پہچانا نہ جاتا تھا..

''کیوں پوچھتے ہو کبوتر کہاں گئے..''

''میں اُن کو دانہ ڈالنے آیا تھا'' میں نے اپنی پُھولی ہوئی جیب کو تھپک کر کہا جس میں دانے والی پوٹلی ٹُھنسی ہوئی تھی..

''صرف کبوتروں کے لئے یہاں آئے تھے..''

''نہیں.. داتا کے قدموں میں بیٹھنے کے لئے آیا تھا..''

''کبوتر تو مر گئے مولا..''

اُس کی آنکھیں چرسی آنکھیں سُکڑی ہوئی بیر بہوٹیوں کی مانند اُس کے جھرّیوں بھرے چہرے میں مُردہ پڑی تھیں.. کیا وہ مُجھے دیکھ بھی رہا ہے کہ نہیں.. وہ ایک فاتر العقل شخص تھا جس کے حواس تقریباً معطل ہو چکے تھے.. ایک ایسا مجذوب تھا جس کا جذب تب جاگتا تھا جب اُسے چرس کے دھوئیں کی دُھونی دی جاتی تھی.. وہ اپنی مردہ آنکھیں بمشکل کھولتا اور مولا اِی مولا کا ایک نعرہ لگا کر پھر سے اُسی حالت مُردنی میں دفن ہو جاتا.. ان مرقدوں اور مزاروں پر ایسے ہی مجذوب پڑے رہتے ہیں اور دُکھی لوگ آس لے کر آتے ہیں کہ داتا کا یہ ملنگ اُن کی جھولی میں سُکھ کے چند چاول ڈال دے گا..

اور دُکھ کے مارے ہوئے، معاشرے کی ناانصافیوں کی ذلتوں کے مارے ہوئے لوگ آخر کہاں جائیں.. یہ بے حیثیت نادار اور بے وقار لوگ فریاد کہاں کریں.. وہ مزاروں کی چادروں کو اپنی بے بسی کے آنسوؤں سے گیلا کرتے ہیں، چوکھٹوں کو چُومتے ہیں، جالیوں میں فریادوں کے دھاگے باندھتے ہیں، اپنے دُکھ کی دوا کے متلاشی رہتے ہیں اور ایسے ماؤف ہو چکے لوگوں کو ولائت کے درجے پر فائز کر کے اُن سے اپنے درد کا درماں چاہتے ہیں.. اور کیا کریں..

داتا کے مرقد کی پائینتی کے قریب چند عقیدت مند سر جھکائے کسی ورد میں مشغول تھے، مُجھے دیکھ کر وہ ذرا سرک گئے اور میں بھی اُن میں شامل ہو گیا.. اور سر جھکا کر بیٹھ گیا.

سر جھکا لیا ہے تو اب کیا کروں.. کس اسم اعظم کا ورد کروں، کونسی دعا مانگوں، کیسے ملتجی ہو جاؤں، اس وبا سے نجات کی، اپنی رہائی کی دوہائی کیسے دوں.. لیکن میرا ذہن اُس تختی کی مانند خالی ہو چکا تھا جسے دھو کر گاچنی سے لیپ پوت کر دھوپ میں سکھا لیا گیا تھا اور اب اُسے دیکھ کر کچھ گمان نہ ہوتا تھا کہ اس پر کیا کیا عبارتیں رقم ہوا کرتی تھیں.. اور رقم کس نے کیں.. کیا اس تختی پر کچھ بھی رقم کرنے کا اختیار کبھی میرے پاس تھا بھی یا نہیں.. میں خوب جان گیا ہوں، مہ و سال کی ان طویل مسافتوں کے دوران مجھ پر منکشف ہو چکا ہے کہ یہ تختی محض میری دل جوئی کے لئے تخلیق کی گئی تھی کہ ہاں تم لکھ سکتے ہو، رقم کر سکتے ہو اس پر اپنی تمام خواہشیں اور آرزوئیں اور وہ پوری کر دی جائیں گی.. کیسا فریب دیا گیا تھا، سراسر دھوکا.. آپ اس تختی پر لکھتے لکھتے نابینا ہو جاؤ لیکن ہو گا وہی جو طے کر لیا گیا ہے.. عبث ہمیں بدنام کیا..

چنانچہ میں نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں خواہشوں کا کوئی دیا روشن کیا اور نہ ہی طلب کی کسی چنگاری کو ہوا دی.. مُلتمس ہوا نہ مُلتجی.. یوں خالی الذہن ہو کر بیٹھا رہا جیسے میں مردہ ہو چکا ہوں اور یہاں دفن ہونے آیا ہوں.. لب مقفّل، کوئی پکار نہ فریاد.. میں چُپ بیٹھا رہا..

میں نے ایک موٹر سائیکل سوار کو اشارہ کیا اور وہ تھوڑی دور جا کر رُک گیا.. اُس نے اپنے عقبی آئینے میں وہی دیکھا جو ہر سویر مُجھے آئینے میں نظر آتا تھا، بے تحاشا بڑھے ہوئے سفید بالوں والا ایک ایسا بوڑھا جس کے ارد گرد زندگی کا میلہ اجڑ رہا ہے اور وہ ایک

گمشدہ بچے کی مانند حیران کھڑا ہے..

جوں جوں آپ شہر کی گھناوٹ کے قریب پہنچتے تھے تو لاک ڈاؤن پگھلتا ہوا نظر آتا تھا.. بیشتر لوگ ماسک کے بغیر بے فکری سے گھوم رہے تھے جیسے اُن تک کورونا کی آمد کی خبر ابھی تک نہیں پہنچی.. شہر کے شور نے مُجھے پریشان کر دیا کہ مُجھے اس کی عادت نہ رہی تھی.. اُس موٹر سائیکل سوار نے ترس کھا کر مُجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور جب میں نے اُسے بتایا کہ میں داتا صاحب جانا چاہتا ہوں تو وہ کندھے سکیڑ کر کہنے لگا "بابا جی.. اب وہاں کون جاتا ہے.. مکّہ مدینہ ویران پڑے ہیں تو داتا صاحب بے چارے کس شمار قطار میں ہیں.. 65ء کی جنگ میں کہتے تھے کہ داتا صاحب لاہور پر پھینکے جانے والے دشمن کے بموں کو اِدھر اُدھر کر دیتے تھے.. اب اس وبا کو بھی دبوچ کر اِدھر اُدھر کریں تو مانیں.. آپ کیا کریں گے وہاں جا کر؟"

"کبوتروں کو دانہ ڈالنا چاہتا ہوں.."

میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا، شائد وہ مسکرایا تھا..

داتا دربار کے باہر جہاں دن رات سینکڑوں دیگیں سلگتے چولہوں سے اترتی چڑھتی تھیں وہاں جانے کب سے بُجھے ہوئے کوئلے پڑے تھے جن پر راکھ کی تہہ کو وبا نے اڑا دیا تھا..

کیا یہ معبد اور مرقد صرف ایک وبا کے ڈر سے خود ہی متروک ہو گئے ہیں، ان کی حیثیت بس اتنی سی ہے کہ موت کے خدشے کے سامنے ہتھیار ڈال دیں..

"لو بابا جی.. چلو ہمارے لئے بھی دعا کر دیکھنا." مہربان موٹر سائیکل سوار نے مُجھے

اتارتے ہوئے کہا ''ہمیں بھی داتا کے کبوتر ہی سمجھنا. تھوڑا سا دانہ ہمیں بھی ڈال دینا.'' کیا اُس کے لہجے میں طنز پوشیدہ تھا..

میرا ذہن خالی تھا اور میری آنکھیں خالی ہو رہی تھیں...وبا کے ان دنوں میں وہ بھی شہر ہوئی جاتی تھیں، گلی کوچے ہو رہی تھیں..

راہبراں را پیر کامل کے سرہانے جو لوگ سر نیہوڑے لگتا تھا کہ گہرے استغراق میں ہیں شائد وہ بھی میری طرح خالی الذہن ہو چکے ہیں، حالت استغراق میں نہیں، حالت شرمندگی میں بیکار بیٹھے ہیں ورنہ پچھلے زمانوں میں تو ان کے سرہانے جگہ نہ ملتی تھی، لوگ قرآن پاک کے اوراق پر آنکھیں رکھے سر ہلاتے ہوئے، اشک بار ہوتے تھے..

موٹر سائیکل سوار نے کیا کہا تھا، داتا صاحب اگر کورونا کو دبوچ کر اِدھر اُدھر کریں تب جانیں، یا شائد تب مانیں..یقیں مُحکم وغیرہ اُٹھتے جا رہے تھے..

میرے اردگرد سر جھکانے والے کہیں دور سے نہیں، آس پاس سے ہی آئے تھے..شائد اس امید میں آئے ہوں کہ داتا کا لنگر جاری ہوگا اور وہ کم از کم چنے والے چاولوں سے جھولی بھر لیں گے اور اپنے بچّوں کے لئے بھی لے جائیں گے جنہیں وبا کے دنوں میں پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا تھا..یہ دہاڑی دار لوگ لگتے تھے، لاک ڈاؤن کی فضیلت تو اپنی جگہ لیکن روزانہ کی مزدوریاں کرنے والے لوگ اچھے حالوں میں نہ تھے..اُن میں سے کچھ کے بوسیدہ کپڑے پینٹ کے چھینٹوں سے لتھڑے ہوئے تھے اور میں دیکھ سکتا تھا کہ جب وہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے تھے تو اُن ہاتھوں میں مشقت کے نتیجے میں اُبھری ہوئی

مردہ گوشت کی گانٹھیں تھیں.. پھٹ چکے آبلے تھے.. اُنہیں غمِ روزگار سے فرصت ہی نہ تھی
کہ وہ عبادت کی مزدوری کر کے اپنے ماتھوں پر محراب کی برگزیدگی سجاتے..

وبا نے تخصیص تو کی تھی.. وہ مجھ ایسے نیم آسودہ لوگوں کی نسبت ان دیہاڑی دار
مشقت پیشہ لوگوں کو اپنی ہلاکت خیزی سے نہ سہی، اس ہلاکت خیزی سے بچاؤ کے نتیجے
میں بھوک سے شکار کر رہی تھی..

اُن میں سے ایک شخص جس کے میلے چیکٹ بال کانٹوں کی مانند اُس کی کھوپڑی
پر اُگے ہوئے تھے اور اُس سے افلاس کی بُو آ رہی تھی، سرک کر میرے قریب آیا اور کہنے لگا

"بزرگو، میرے لئے بھی دعا کرو.."

"تم خود کیوں نہیں دعا کر لیتے.." میں نے بیزاری سے کہا کہ میں انسانی بُو سے
سخت الرجک ہوں اور خاص طور پر اگر اُس میں افلاس کی آمیزش ہو..

"سرکار ہم تو دعائیں بھول بھال گئے.. دعا کرو داتا کرم کر دے، شہر پھر سے آباد
ہو جائے، ہمارا رزق روزگار جاری ہو جائے.. اور میرا بچہ مل جائے.."

"تمہارا بچہ.."

"ہاں آپ پہنچے ہوئے لگتے ہو دعا کرو کہ وہ مل جائے.. تین روز پہلے گھر سے
ایک پوٹلی لے کر نکلا ہے، کہتا تھا شہر بھر میں سخی لوگ راشن پانی کے تھیلوں کے ڈھیر لگائے
بیٹھے ہیں.. گیا اور واپس نہیں آیا.."

اُسے میرے قریب ہوتا دیکھ کر مرقد کے سرہانے سمٹے سمٹائے بیٹھے کچھ اور لوگ
سرک سرک کر میرے پاس ہو بیٹھے.. "بزرگو! آپ کرامت والے لگتے ہو.. ہمارے حق میں

بھی دعا کرو..''

میں اپنے بے تحاشا بڑھے ہوئے سفید بالوں اور بڑھاپے کی نقاہت کی وجہ سے صاحبِ کرامت کے درجے پر فائز کر دیا گیا تھا..

میری نگاہ صحن کی جانب گئی تو اُس نگاہ میں تیز دھوپ اترنے لگی.. مُجھے وقت کا خیال نہ رہا تھا..ایسا نہ ہو کہ بچے بیدار ہو جائیں اور میری غیر موجودگی سے آگاہ ہو جائیں، مجھے واپسی کا سفر اختیار کرنا چاہیے..وہ جو میرے ساتھ جُڑ جُڑ کر بیٹھتے تھے میں اُن سے الگ ہوا اور مرقد سے باہر صحن میں آ گیا..صحن کی روشن ہوتی ویرانی میں گندے کپڑوں کا ایک ڈھیر سا پڑا تھا میں قریب ہوا تو اُس میں حرکت نمودار ہوئی..یہ وہی نشے باز مجذوب تھا، سکڑی ہوئی مردہ بیر بہوٹیوں جیسی آنکھوں والا...وہ صحن کی دھوپ میں اُونگھ رہا تھا، مُجھے دیکھ کر مسکرایا..

''مولا تمہارا کام ہو گیا؟''

''ہاں ہو گیا.''

''نصیب والے ہو ان دنوں سب نامراد جاتے ہیں..مولا کبوتروں کا دانہ گھر واپس لے جا رہے ہو..اُن کا رزق ہے، دانہ ڈال کے جاؤ..'' اُس کی مُردہ آنکھوں میں عیاری کے سُرخ ڈورے تیرتے تھے..

''تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ کبوتر مر گئے ہیں..کبوتر کیسے مر گئے؟

''جیسے بھکاری کو بھیک نہ ملے تو وہ مر جاتا ہے مولا..ایسے..'' وہ لمحہ بہ لمحہ حواس میں آ رہا تھا..''ان کبوتروں کو عادت ہی نہ تھی کہ خود سے اپنا دانہ دُنکا تلاش کریں..زائر پوٹلیاں

بھر بھر کے لاتے تھے اور صحن میں بکھیر دیتے تھے.. کبوتر جب بھی مرتے تھے پر بدہضمی کی وجہ سے.. کتوں کی مانند وہ بھی نہیں جانتے کہ کب اُن کا پیٹ بھر گیا ہے.. پہلے بدبودار اور گیلی بیٹیں کر کر کے صحن گندا کرتے تھے، پھر یکدم مر جاتے تھے.. اب کتنے دن ہو گئے ہیں ادھر کوئی آتا ہی نہیں، لوگوں کو اپنے دانے پانی کی پڑی ہے کبوتروں کو کہاں سے کھلائیں.. کبوتروں نے خالی فرش پر چونچیں مار مار کر اپنی چونچیں توڑ لیں.. جب دانہ دُنکا نہ ملا تو لاغر ہو کر مرنے لگے.. صرف میں ہوں جو دن رات داتا کے صحن میں پڑا رہتا ہوں.. داتا کی نگہبانی پر مامور سرکاری اہلکار کورونا کے ڈر سے اپنے حُجروں سے باہر نہیں آتے چنانچہ کفن دفن کے لئے بھی میری ہی ڈیوٹی ہے مولا..''

''کس کے کفن دفن کی..'' میں نے چونک کر پُوچھا..

''کبوتروں کے کفن دفن کی مولا.. اور کس کی.. ہر روز صحن میں پڑے مُردہ کبوتروں کو جھولی میں ڈال کر باہر کوڑے دان میں پھینک آتا ہوں.. میں نہ ہوتا تو یہاں ہر طرف مُردہ کبوتروں کی لاشیں گل سڑ رہی ہوتیں.. ویسے تم سے کیا پردہ مولا.. دو چار سُوٹے لگا لو تو کچھ تمیز نہیں رہتی کہ کبوتر زندہ ہے یا مر چکا ہے، دو چار جن میں کُچھ دم ہوتا ہے اُنہیں حلال کر کے کڑاہی میں بُھون بھان لیتا ہوں.. دم نہ بھی ہو تو ذائقے میں کُچھ فرق نہیں پڑتا.. شام تک میرے ساتھ پڑے رہو کبوتر کڑاہی کھلاؤں گا مولا..''

''بہت بہت شکریہ.. لیکن مُجھے گھر واپس پہنچنا ہے..''

''اور کبوتروں کا رزق بھی واپس لے جا رہے ہو..''

''اگر کبوتر مر گئے ہیں تو دانہ کس کو ڈالوں.. تمہیں'' میں اُس سے پیچھا چھڑاتا

چاہیے تھا..

"سارے تو نہیں مر گئے مولا.." اُس کی مسکراہٹ کس قدر غلیظ تھی "سارے تو نہیں مر گئے.."

میں نے جیب میں سے پوٹلی نکال کر کھولی، دھوپ میں روشن ہوتے صحن کی وسعت تمام آنکھوں میں بھری تو وہاں وہ بندہ تو تھا مردہ بیر بہوٹی آنکھوں والا لیکن پرندہ کوئی نہ تھا..

"کبوتر تو نہیں ہیں."

"آ جائیں گے مولا، اُنہیں کیا پتہ کہ آج اُن کے رزق کا بندوبست ہو گیا ہے.. پتہ چلے گا تو وہ چلے آئیں گے..اُن کا رزق فرش پر بکھیر و تو سہی.."

میں جھجک رہا تھا..

"بکھیر دو" اُس نے غصے کو یوں آنکھوں میں بھرا کہ وہ مردہ بیر بہوٹیاں بھی جیسے زندہ ہو کر سرکنے لگیں..

میں نے کھلی پوٹلی میں سے مٹھی بھر کے دانے فرش پر ڈال دیئے..انتظار کیا، کچھ وقت گزر گیا لیکن مجھے کسی پرندے کی پھڑپھڑاہٹ سنائی نہ دی..صحن میں بکھرے دانے مایوسی کے عالم میں پڑے تھے..میں نے سوالیہ نظروں سے اُس مجذوب کی جانب دیکھا..
"آ جائیں گے مولا..صبر کرنا پڑے گا..اُنہیں اطلاع کرنی پڑے گی" تب اُس نے مُنہ پر ہتھیلی جما کر صحن کے ارد گرد جو در و دیوار دھوپ میں تھے اور اُن میں جو روزن اور طاقچے تھے، محرابیں اور گنبد تھے گویا اُن سے مخاطب ہو کر پکار کی "مولا..آ جاؤ..آ جاؤ.."

وہ جوامکان کی حدوں کے پار ہوتا ہے اُس کا یکدم نزول آپ کو بیک وقت خوشی
میں مبتلا کردیتا ہے..جیسے کڑی دھوپ میں آسمان بے مروت حد تک خالی ہو اور یکایک بارش
کی بوچھاڑوں کا نزول ہو جائے..جیسے آپ کے ذاتی کمرے کے فرش میں سے گلاب پھوٹنے
لگیں تو آپ ایک تحیرّ آمیز صدمے میں چلے جاتے ہیں کہ یہ کیا ہوا.جس کا امکان نہ تھا
ایسے وہ سب نمودار ہوئے..در و دیوار میں سے پھوٹنے لگے،جیسے غیب میں موجود تھے اور
مولا آجاؤ کی پکار پر ظہور میں آ گئے..وہ جھپٹتے چلے آتے تھے..جہاں کہاں وہ پوشیدہ تھے بھوک
سے نڈھال پڑے تھے،روزنوں اور طاقچوں میں،گنبدوں کی گولائی میں کہیں چھپے ہوئے وہ
پھڑ پھڑاتے جھپٹتے لیکن چونچیں بند کئے،مقفل خاموشی کے ساتھ چلے آئے..اتنی کثرت میں
کہ صحن میں اتری دھوپ سہم کر سمٹ گئی اور ایک سُرمئی اندھیرا چھا گیا..جس بھوک کی وحشت
سے وہ اترتے آتے تھے مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ مجھ پر جھپٹنے کے لئے چلے آتے ہیں اور مجھے
نوچ نوچ کر کھا جائیں گے..میں پرندوں کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا تھا..میں نے فرش سے
اٹھنے کی کوشش کی لیکن میرے گھٹنے اٹھتے اٹھتے جواب دے گئے اور میں سنگِ مرمر کی سفیدی
پر جس پر سرمئی اندھیرا اثر انداز ہو رہا تھا ڈھیر ہو گیا..

اور وہ ہجوم کرتے مجھ تک اتر آئے..

تب مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ پر نہیں فرش پر بکھرے دانوں پر جھپٹ رہے ہیں
لیکن اُن کی بھوکی چونچیں تمیز نہیں کر پا رہی تھیں کہ فرش پر بکھرے یہ دانے ہماری خوراک ہیں
یا یہ بُوڑھا جو فرش پر لاچار پڑا لرزش میں ہے..البتہ وہ میری مُٹھی میں بھنچی پوٹلی پر بھی چونچیں
مار رہے تھے اور کُچھ چونچیں بھٹک کر میرے ہاتھ اور بدن کے دیگر حصوں میں بھی اترتی تھیں،

اُسترے کی دھار ایسی تیز چونچیں. مجھے خدشہ تھا تو صرف یہ تھا کہ کہیں وہ میری پژمردہ آنکھوں پر نہ پل پڑیں.. کاگا چُن چُن کھائیو ماس.. کہیں میری اکھیاں نہ کھا جائیں جن میں کسی بھی پیا کے ملنے کی آس نہیں، اگر آس ہے تو اُس کی جس کا ذائقہ ہر ذی نفس کو چکھنا ہے... میں نے جلدی سے پوٹلی میں جتنے بھی دانے تھے فرش پر اُلٹ دیے اور فرش پر بمشکل سرکتا اُس بھوکے غول سے ذرا پرے ہو گیا.. میں اب بھی ایک گہرے ڈر میں تھا، ایسا نہ ہو کہ دانوں سے اُن کی بھوک نہ مٹے اور وہ مجھ پر یلغار کر دیں.. اُن میں سے جن کی چونچیں میرے خون کے ذائقے سے آشنا ہو گئی تھیں وہ اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر مجھ پر اُمڈ پڑیں..

''ڈر گئے مولا...'' وہ اپنے پیلے دانت نکالتا میرے سر پر کھڑا تھا..

پھر جس تیزی سے ناگہانی طور پر وہ نمودار ہوئے تھے اُسی طرح پھڑ پھڑاتے.. جس غیب سے وہ ظہور میں آئے تھے اُس میں پھر سے غیب ہو گئے.. دھوپ جو ہراساں ہو کر سمٹ گئی تھی پھر سے صحن میں پھیل گئی..

''کل بھی آؤ گے؟''

''نہیں..''

''نہیں آؤ گے تو یہ پہنچ جائیں گے مولا..''

''کہاں پہنچ جائیں گے..''

''جہاں سے تم آئے ہو مولا.. تمہارے خون کی بُو سونگھ چکے ہیں، پہنچ جائیں گے..''

سفید فرش خالی تھا، ایک دانہ بھی نہ بچا تھا، لیکن یہ سراسر خالی نہ تھا. وہاں چار پانچ

کبوتر پڑے تھے جیسے چھینا جھپٹی کے دوران مر گئے ہوں..

مردہ پیر بہوٹیوں کی آنکھوں والے نے انہیں باری باری اٹھایا، گردنوں پہ انگلی رکھ کر کچھ توقف کیا اور کہنے لگا "ابھی کچھ جان باقی ہے.. مولا نے میرے رات کے دانے پانی کا بھی بندوبست کر دیا ہے.."

وبا کے یہ دن رات جانے کبھی رخصت ہوں گے بھی یا نہیں..
اگر نہ ہوئے تو کیا اس برس عُرس کے موقع پر داتا صاحب کو عرق گلاب کی بجائے الکوحل کی آمیزش والے سینی ٹائزر سے غسل دیا جائے گا..

ایک دستک ہوئی..

میں نے قدرے توقف کے ساتھ کہ یہی ہدایات تھیں، دروازہ کھولا اور باہر فرش پر رکھی دوپہر کے کھانے کی طشتری اٹھا کر اندر لے آیا..

آج میری مکمل قید تنہائی کا چوتھا دن تھا..

میرے پوتوں کو اب میرے کمرے میں جھانکنے کی بھی اجازت نہ تھی..ان چار دنوں میں میں نے گھر کے کسی فرد کی شکل نہیں دیکھی تھی..

جیسے قید تنہائی کے قیدی کو مقفل آہنی دروازے میں نصب ایک لیٹر بوکس نوعیت کے مستطیل شگاف میں خوراک کی ٹرے رکھ کر دستک دی جاتی تھی کہ اپنا کھانا اُٹھا لو ایسے ہی میرے دروازے پر بھی تین وقت دستک ہوتی تھی، میں انتظار کرتا تھا کہ کھانا رکھنے والا چلا جائے پھر دروازہ کھول کر ٹرے اٹھا لیتا تھا..

صُبح کی سیر بھی مکمل طور پر منسوخ کر دی گئی تھی..

میں مکمل طور پر الگ کر دیا گیا تھا.. مُجھ پر قرنطینہ لاگو ہو چکا تھا..

ہدائت یہ تھی کہ کھڑکی کو ہمہ وقت پردہ پوش رکھا جائے اگرچہ میں چوری چھپے کبھی کبھی خلاف ورزی کرلیا کرتا تھا.. یوں باہر کی آوازیں بھی کسی حد تک منقطع ہو چکی تھیں..

البتہ پچھلے چار روز کے دوران دو ہوائی جہاز جو شائد غیر ممالک میں گھرے ہوئے پاکستانیوں کو واپس لا رہے تھے، گھر کے اوپر سے گزرے تو اُن کی ملفوف گرج نے میری تنہائی کے سناٹے میں عارضی سی خراشیں ڈال دیں جو اُن کے گزرتے ہی مندمل ہو گئیں..اُن کی آوازوں نے مُجھے خوشی سے ہمکنار کیا کہ..زندگی ہے.اور میں چوری چھپے جو خلاف ورزی کرلیا کرتا تھا، کھڑکی کا پردہ ذرا سرکا کر باہر جھانک لیا کرتا تھا تو صرف اس لئے کہ میں اپنی منڈیر دیکھنے کے لئے بیتاب رہتا تھا، دیکھنے کے لئے کہ آج اُس پر کونسے پرندے اترے ہیں.وہ کن رنگوں کے اور کن نسلوں کے ہیں اور کیا وہ آگاہ ہیں کہ وہ بوڑھا شخص جو کھڑکی میں سے انہیں ہمہ وقت تکتا رہتا تھا اب وہاں موجود نہیں ہوتا..کیا وہ میری غیر موجودگی کو محسوس کرتے ہیں، میرے لئے اداس ہوتے ہیں.

قید کی کاملیت کے ان دنوں میں بھی وہی عام سے پرندے اترتے رہے، کسی نئے پرندے کی شکل دکھائی نہ دی..وہ سون چڑیاں بھی نظر نہ آئیں جو منڈیر کی کائنات میں رنگ بھرتی تھیں..شائد اُن کی آمد کے موسم گزر چکے تھے..اگرچہ اب میں پرندوں کی بجائے پرندوں کی کتابی دنیا میں زیادہ مگن رہتا ہوں..بیشتر پرندوں کے بچے ایک جیسے لگتے ہیں..شائد اُنہیں بھی انسانوں کے بچے ایک جیسے لگتے ہوں گے..

اگر مُجھے میرے اپنوں نے ہی یوں الگ تھلگ کر دیا تھا جیسے میں کوئی اچھوت ہوں، مُجھے اپنے کمرے کی تنہائی میں محبوس کر دیا تھا تو اس میں قصور میرا اپنا ہے..

اُس روز داتا صاحب سے واپسی پر، اور مُجھے دیر ہو گئی تھی، دھوپ پھیل چکی تھی. میرا بیٹا بے چینی سے گیٹ کے باہر ٹہل رہا تھا.. مجھے دیکھ کر پہلے تو اُس کا پریشان چہرہ ایک اطمینان کی کیفیت میں اترا، اُس کے چہرے کا کھنچاؤ اور کرب زائل ہوا اور پھر فوراً ہی اُس کی تیوڑھی چڑھ گئی.. ''بابا، آپ کہاں تھے.. کہیں سیر کے دوران چکّر تو نہیں آنے لگے تھے، اتنی دیر کیوں کر دی.. میں تو سکیورٹی پولیس کو اطلاع کرنے والا تھا.. کہاں تھے؟''

اس سے پیشتر کہ میں کوئی بہانہ تراشتا، جھوٹ سچ گھڑتا وہ میرے قریب ہوا اور اُس کا چہرہ تشویش سے بھر گیا ''یہ آپ کے چہرے اور ہاتھوں کو کیا ہوا ہے بابا.. کہیں گر گئے تھے..''

''نہیں.. وہ دراصل.. آئی ایم سوری بیٹے.. میں داتا صاحب چلا گیا تھا، وہاں دیر ہو گئی..''

''داتا صاحب..'' اُس نے بے یقینی سے کہا ''وہاں کیا کرنے گئے تھے.. کیوں گئے تھے؟''

''میں.. کبوتروں کو دانہ ڈالنے گیا تھا..''

''کبوتروں کو؟'' اُس کی بے یقینی میں غصہ گھلنے لگا ''اور یہ خون آلود خراشیں..''

''وہ بہت دن سے بھوکے تھے.. اُنہوں نے جان بوجھ کر مجھے زخمی نہیں کیا.. بس ایسا ہو گیا..''

اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے کیسے سرزنش کرے.. اور وہ چپ ہو گیا.. کچھ دیر بعد لاچارگی سے احتجاج کے طور پر اپنے لامبے بازو فضا میں بلند کر دیئے..

''میں نہ جاتا تو وہ بھی مر جاتے..'' میں نے پشیمانی میں سر جھکا لیا ''اُنہیں عادت نہیں رہی اپنا دانہ پانی خود سے تلاش کرنے کی اس لئے بہت سے مر گئے.. فاقوں سے لاغر ہو کر مر گئے.. جو باقی رہ گئے ہیں، میں نہ جاتا تو وہ بھی مر جاتے.. اُنہوں نے جان بوجھ کر مجھے گزند نہیں پہنچائی، وہ بھوکے بہت تھے..''

''آپ اندر چلیں'' اُس نے میرا بازو تھام لیا ''آپ کی خراشوں سے خون بہہ رہا ہے..''

گھر کے اندر جا کر اُس نے پہلے تو نہائت احتیاط سے میری خراشوں کو ڈیٹول سے دھویا اور پھر اُن پر کسی کریم کی ہلکی سی تہہ جما دی.. وہ جو ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اُن کی چُبھن قدرے کم ہو گئی..

''اور بابا.. وہاں داتا صاحب کے دربار میں اور لوگ بھی تھے؟''

''ہاں تھے تو سہی لیکن زیادہ نہ تھے'' میں نے اپنی خفت مٹانے کی خاطر ضرورت سے زیادہ مسکراتے ہوئے جواب دیا ''اور اُنہوں نے جانے مجھے کیا سمجھ لیا، مجھ سے لپٹ

لپٹ کر التجائیں کرتے تھے کہ میں.. میں اُن کے لئے دعا کروں.. جاہل لوگ تھے ناں..''

''آپ سے وہ لپٹ رہے تھے.. گویا آپ اُن سے ایک محفوظ فاصلے پر نہیں تھے..''

''بیٹا میں نے کوشش تو بہت کی کہ اُن سے پرے پرے رہوں لیکن وہ تو میرے گرد ہو گئے، میں کیا کرتا.. اِن دنوں میری شکل بھی تو عجیب سی ہو گئی ہے ناں، ایک مدت سے بال بھی نہیں کٹوائے اور وہ بکھرے بکھرے رہتے ہیں، کیا میں واقعی اپنی ہیئت سے آرزوئیں پوری کرنے والا کوئی بابا وغیرہ لگتا ہوں، ہیں بیٹا؟'' میں پھر ایک بڑی مسکراہٹ اپنے چہرے پر لے آیا، میرا خیال تھا کہ وہ شائد قدرے محظوظ ہو جائے، اُس کی ناراضی میں کچھ کمی واقع ہو جائے پر ایسا نہ ہوا..

''بابا، آپ اپنا نہیں تو اپنے بچّوں کا ہی کچھ خیال کرتے.. وہ جو بقول آپ کے آپ کے ساتھ لپٹتے رہے ہیں اُن میں سے کچھ تو کورونا کا شکار ہوں گے اگرچہ وہ نہیں جانتے ہوں گے کہ یہ غریب لوگ کہاں احتیاط کرتے ہیں.. بابا اگر خدانخواستہ سانس کے ذریعے کورونا کے جراثیم آپ کے اندر جا چکے ہیں اور آپ بیمار پڑ جاتے ہیں تو جانتے ہیں کیا ہوگا.. وہ آپ کو زبردستی لے جائیں گے اور ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے.. آپ وہاں سرکاری ہسپتال میں تنہا پڑے رہیں گے.. آپ نے اتنا خیال بھی نہ کیا بابا..''

ایک بوڑھے شخص کو جب ڈانٹا جاتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اُسے کسی نہ کسی قصور کی بنا پر ڈانٹا جا رہا ہے تو وہ ایک عجیب بے چارگی میں چلا جاتا ہے.. جیسے ایک پلّے کو ڈانٹتے ہیں تو وہ دبک جاتا ہے اور رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگتا ہے.. بڑھاپا اپنے آپ میں ایک بے چارگی

ہے، ایک ایسی مظلومیت ہے کہ بوڑھا انسان خود اپنے آپ پر ترس کھانے لگتا ہے۔
میرے پاس اپنے دفاع میں کہنے کے لئے کُچھ بھی نہ تھا، کیا کہتا کہ بیٹے میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں، میرے اعضاء میں اعتدال نہیں رہا، میرے ذہنی خلیے بھی بیمار ہو چکے ہیں تو مجھے معاف کر دو..

میں نے ایک پلّے کی مانند ہی رحم طلب نظروں سے اپنے بیٹے کو دیکھا..

اولاد کے بارے میں میرا تجربہ ہے کہ جب کبھی وہ بجا طور پر اپنے بوڑھے ہو چکے باپ کو سرزنش کرتی ہے، کبھی طیش میں آ کر حد سے تجاوز بھی کر جاتی ہے تو باپ کے چہرے پر بڑھاپے سے لاچار ہو چکے ایک فقیر ایسی بے چارگی اترنے لگتی ہے تو عین اُسی لمحے اولاد کا روّیہ بدل جاتا ہے، اُن کے بدن میں شرمندگی کے تھوہر کے پسینے پھوٹنے لگتے ہیں، وہ اپنے آپ کو مطعون کرنے لگتے ہیں کہ میں نے یہ کیا کِیا اور وہ نہیں جانتے کہ اس زیادتی کا مداوا کیسے کیا جائے..ایک ایسے بچے ہو جاتے ہیں جو ابھی تک اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر چلتا ہے، شرمندگی کے بوجھ سے دھنستے چلے جاتے ہیں..وہ اس قدر پشیمان ہوتے ہیں کہ اب باپ کو اُن پر ترس آنے لگتا ہے..

"سوری بابا.." میرے بیٹے کے ساتھ بھی یہی ہوا اور اُس نے سر جُھکا لیا..
پھر آگے بڑھا معاشرتی فاصلے کی احتیاط بھی بُھول گیا اور مُجھے گلے لگا لیا "سوری بابا" اُس نے پھر بہت رنج آلود لہجے میں کہا اور اُس کی آنکھیں بھیگنے لگیں "دن رات کی ان احتیاطوں کی وجہ سے ہم سب میں ضبط کم ہو گیا ہے..معاف کر دیں"

میں نے اُسے پیار سے دھکیل کر پرے کر دیا "بیٹے معاشرتی فاصلے کا دھیان رکھا کرو"

اس کے چہرے پر شرمندگی کی جو شدت تھی میں اس کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ میں اسے کبھی ناخوش نہ دیکھ سکتا تھا اور نہ یوں شرمندہ ہوتا دیکھ سکتا تھا۔ میرا دل کٹتا تھا۔ اس کے لہجے میں جو ملائمت اور معصومیت آ گئی تھی اب مجھے شرمندگی ہونے لگی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا اور نہائت دھیمی آواز میں یوں بولا جیسے وہ میری گود میں ہو اور میں اسے سلانا چاہتا ہوں'' بیٹے بس غلطی ہو گئی..اور اس غلطی کی پاداش میں میں خود اب اپنے کمرے سے باہر قدم نہیں رکھوں گا..اپنے آپ کو قرنطینہ کے سپرد کر دوں گا تا کہ تم سب محفوظ رہو۔ طے تم کرو کہ کتنے روز کے لئے..''

''دس روز کافی ہوں گے بابا..'' وہ بھی مسکرانے لگا..

''اور اب میں دس روز تک تمہاری فضول شکل نہیں دیکھنا چاہتا..پھر جی بھر کے دیکھ لوں گا..اس دوران میری بہو جو کھانا بھی تیار کرے گی وہ تم نے دستک دے کر میرے کمرے کے باہر رکھ دینا ہے..اندر نہیں آنا..''

''او کے بابا..'' وہ پھر رنجیدہ ہو گیا..

''قرنطینہ شروع..'' میں اُس کے رخسار پر تھپکی دیتا دیتا رُک گیا، اپنے کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر لیا..

میرا خیال ہے کہ وہ کچھ دیر دروازے کے باہر کھڑا رہا، پھر مجھے سیڑھیاں چڑھتے اُس کے قدموں کی چاپ سُنائی دی اور پھر ہر سُو خاموشی اتر آئی..

آج وبا کے خوف سے نافذ کردہ اس تنہائی کا پانچواں دن تھا..

مُجھ سے ایک فاش غلطی ہوگئی تھی..

مُجھے اُن نیم مُردہ کبوتروں کو چیک کرنا چاہیے تھا جو مُردہ بیر بہوٹیوں ایسی آنکھوں والا شخص رات کے دانے پانی کے لئے اٹھا کر لے گیا تھا..

کیا پتہ اُن میں کوئی ایک نامہ بر کبوتر ہو..

مُجھے اُن کے پنجوں تلے ٹٹولنا چاہیے تھا، ہوسکتا ہے وہاں کوئی سندیسہ بندھا ہو..

اور سندیسہ بھیجنا کس نے تھا؟

اُسی نے جس نے اس وبا کو بھیجا تھا..

شائد اب اُس نے خلقِ خدا کی حالت زار اور شہروں کی ویرانیوں پر ترس کھا کر اس سے نجات کی کوئی ترکیب بھیجی ہو..

اگر کوئی سندیسہ نجات کا آیا تو نامہ بر پرندہ اسی منڈیر پر اترے گا..

فاختہ اڑتی چلی جارہی تھی..

وہ بے انت زمانے اڑی، وقت کے سب پیمانے اُڑی..

اُس کے کومل بدن میں تھکاوٹ کا ایک ذرّہ نہ تھا..وہ ابھی ابھی تو کوزہ گر کے چاک سے اتری تھی، اُسی کے ہاتھوں نے اُسے تراشا تھا، اُس کی سجاوٹیں بناوٹیں تخلیق کی تھیں اور کوزہ گر کے ہاتھوں میں کُن فیقون کی جو حدّت تھی اُس کی ایک چنگاری اُس کے کچے کومل بدن میں سرائت کر کے اُس کے خون میں یوں گردش کر رہی تھی کہ خون کی ہر بوند میں سے اناالحق کی سرگوشیاں سنائی دینے لگی تھیں..

وہ تب تک اڑ سکتی تھی جب تک کہ پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند اڑتے نہ پھریں، بجلی کی کڑک سے بستیاں بھسم نہ ہو جائیں اور سب انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کی ہڈیاں جو مٹی میں مٹی ہو چکیں پھر سے ظاہر ہو کر جُڑ نہ جائیں اور وہ سب جو خاک ہو چکے تھے پھر سے وجود میں نہ آ جائیں، وہ تب تک اڑ سکتی تھی..اُس کے پروں کی شُوک کُل کائناتوں پر شرلاٹے بھرتی گونجتی تھی جیسے وہ پروں کی ایک مُٹھی نہ ہو بلکہ اُس کا کومل وجود ان کائناتوں

کے فاصلوں پر حاوی ہو رہا ہو.. میں نے کشتی والے سے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں خشکی کا سراغ لگا کر ہی لوٹوں گی. اور اپنی دریافت کا ثبوت لے کر آؤں گی.. اس لئے کہ اب میرے ناتواں وجود کے اندر بھی وہی الہام نازل ہو رہے ہیں جو صرف کشتی والے پر ہی اترا کرتے تھے.. میں برتر ہو چکی ہوں کہ میرے روئیں روئیں میں سے انا الحق کی سرگوشیاں سنائی دینے لگی ہیں، میں کسی کے حُکم کی تابع نہیں رہی، یہ حکومت میرے وجود میں سانس لینے لگی ہے.. یہ میں ہوں جو انسانی اور حیوانی بقاء کی ضامن ہو گئی ہوں... میرے پروں تلے وبا کے پانیوں کی جس چادر نے پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، انہوں نے کبھی نہ کبھی تو اترنا ہے، خشکی کی کسی نشانی نے تو ابھرنا ہے.. اگر میں بھی حق ہوں تو میری تلاش کیسے لاحاصل ہو سکتی ہے..

کوئی نہ کوئی ہری شاخ پانیوں میں سے ابھرے گی..

کوئی کونپل نمودار ہو گی.. اور میں اُس کونپل کو چونچ میں بھر کے کشتی کی جانب واپس اڑان کر جاؤں گی..

اور کشتی جو وہاں نہیں تھی، اب وہاں ہو گی.. اگر وہ غیب کے دھندلکوں میں کھو چکی ہے تو انا الحق کی ایک پھونک کے طلسم سے وہ پھر سے پانیوں میں سے نمودار ہو جائے گی.. مرچکے کبوتروں کو مرا ہوا سمجھ کر کُوڑے کے ڈھیروں پر پھینک دیا گیا حالانکہ اُن کے پنجوں تلے سندیسے بندھے ہوئے تھے.. یہ نامہ بر کبوتر تھے جو پیغام پہنچا نہ سکے، اب وہی سندیسے میرے خون میں گردش کر رہے ہیں.. میں انہیں پہنچاؤں گی.. خشکی کے کسی نشان پر، کسی ہری شاخ پر، کسی منڈیر پر... میں اتروں گی..

وہ بے تکان اڑتی چلی گئی..

داتا صاحب کے سانحے کو گزرے آج ساتواں دن ہے..

اور سات دن ہی میری اس مکمل قید تنہائی کے گزر چکے ہیں..

ابتدائی احتیاط کے بعد آہستہ آہستہ میں لاپرواہونے لگا ہوں، کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اکثر باہر دیکھتا رہتا ہوں..منڈیر کی سٹیج کو تکتا رہتا ہوں..

محض ایک کھڑکی بھی قدرت کے پوشیدہ رازوں پر کُھل سکتی ہے..

آپ جانتے ہیں کہ پرندوں کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہوتی ہے؟..وہ حرکت میں ہوتے ہیں، اُڑتے پھرتے ہیں، چین سے نہیں بیٹھتے اور اگر کہیں بیٹھ جائیں تو لگتا ہے اُن کے پنجوں تلے دہکتے انگارے آ گئے ہیں، پُھدکنے لگتے ہیں..اگر آپ کو کوئی ایسا پرندہ نظر آئے جو بُت بنا بے حرکت بیٹھا ہے تو جان لیجئے وہ پرندہ نہیں، پرندے کا مجسمہ ہے..

پرندے کُھلی فضا میں آزاد ہوتے ہیں اور کمرے یا کوٹھڑی میں بند شخص کے لئے وہ آزادی کی سب سے بڑی علامت ہوتے ہیں، پرندے سفر میں رہتے ہیں اور انہیں دیکھنے والا بھی اُن کے ساتھ سفر میں رہتا ہے، یہی محسوس کرتا ہے کہ میں بھی پرواز میں ہوں

آزاد ہواؤں میں سانس لیتا ہوں..وہ بھول جاتا ہے کہ وہ قید میں ہے.. پرندوں کو
آنکھوں سے تلاش کرنا بھی ایک مہارت ہے..وہ یا تو درختوں کی چوٹیوں پر پائے جاتے
ہیں یا پھر گھاس کے قطعوں کے کناروں پر اپنی خوراک تلاش کرتے ہیں، یہ میری ذاتی
دریافت ہے۔

پرندے کی سب سے اہم پہچان اُس کی چونچ ہے جسے دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکتے
ہیں وہ کس نوعیت کی خوراک کھاتا ہے..ایک اڑتا ہوا پرندہ صرف دو صورتوں میں اپنی چونچ
استعمال کرتا ہے، وہ اپنا گھونسلا تعمیر کرنے کے لئے اُس میں گھاس پھونس دابے جا رہا ہے یا
پھر اپنے بچوں کے لئے کیڑے مکوڑے بھینچ کر اڑ رہا ہے..اس کے سوا اڑتے ہوئے پرندے
کی چونچ ہمیشہ خالی ہوتی ہے..میرا ایک اور مشاہدہ ہے کہ گھاس پھونس کھانے والے پرندے
قدرے پُرسکون ہوتے ہیں جب کہ کیڑے مکوڑوں کے خوراک بنانے والے ہمہ وقت
بے چین رہتے ہیں، پُھدکتے رہتے ہیں۔

اب آپ کو یقین آ گیا ہوگا کہ میں بھی ''برڈ مین آف ال کٹراز'' کی مانند ایک
کوٹھڑی میں قید محض مشاہدے کی قوت سے ایک پرندہ ایکسپرٹ بنتا جا رہا ہوں..

مُجھے ذاتی طور پر ادب عالیہ سے بس واجبی سا لگاؤ ہے لیکن اتنا ادراک ضرور رکھتا ہوں کہ بڑا ادب کسی خاص خطّے اور مخصوص زمانوں تک محدود نہیں ہوتا، اُس کا پھیلاؤ ہر زمانے پر محیط ہوتا ہے اور وہ ہر دور کے انسانوں کے دکھ سُکھ اور معروضی حالات کی ترجمانی کرتا ہے..

ان دنوں چونکہ خلقِ خدا بیکار بیٹھی ہے اور ادھار کھائے بیٹھی ہے کہ اُس نے مُجھ ایسے لوگوں پر اپنی ادبی لیاقت کی دھاک بٹھانی ہے، ثابت کرنا ہے کہ جتنے بھی بڑے شاعر اور ناول نگار ہو گزرے ہیں اُن سب نے اپنی تخلیقات میں کہیں نہ کہیں وباؤں کی ہلاکتوں اور تنہائیوں کی پیش گوئی کی ہے.. کوئی غالب کے حوالے پیش کرتا ہے تو کوئی ہومر یا ابوانواس سے سند لینے کے لئے چل کھڑا ہوتا ہے. نثر کے میدان میں بھی دور کی کوڑیاں لائی جا رہی ہیں.. میں نے اس کرونا بیانئے کے آغاز میں البرٹ کامیو کے ناول ''دے پلیگ'' کا حوالہ دیا تھا کہ لوگ کیسے وبا کو قبول کرنے سے انکاری ہو جاتے ہیں. اُس سے چشم پوشی اختیار کرتے ہیں جیسا کہ ان دنوں بھی ہو رہا ہے.. اسی طور ہر دانشور گارسیا مارکیز کے ناول ''وبا کے دنوں میں محبت'' کا حوالہ دینا اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے اور ہر کس و ناکس کو مشورہ دیتا

ہے کہ اگر آپ نے گارسیا کا یہ ناول نہیں پڑھا تو فوری طور پر اس کا مطالعہ کر کے کورونا کی وبا کے فلسفیانہ پہلو سے آگہی حاصل کیجئے..

میں اس ناول سے اجتناب کرتے ہوئے گارسیا کی ہی ایک اور تحریر کی جانب آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہوں گا جس کا حوالہ کہیں نہیں آیا..

یہ محض اتفاق ہے کہ پچھلے دنوں میں نے اُس کی کہانیوں کے مجموعے ''نو وَن رائٹس ٹو کرنل'' کا دوبارہ مطالعہ شروع کیا.. میرے ساتھ ایک مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھی ناول یا کہانی چاہے وہ کلاسیک کی حیثیت اختیار کر چکے ہوں اور انہوں نے مُجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو، میرے حواس پر سوار ہو گئے ہیں لیکن کچھ مدت کے بعد میں اُس کے کرداروں کی تفصیل اور واقعات وغیرہ بُھول بھال جاتا ہوں.. گارسیا کی کہانیوں کے ساتھ بھی یہی ماجرا ہوا.. مُجھے محسوس ہوا جیسے میں ان کو پہلی بار پڑھ رہا ہوں، کبھی کبھار شائبہ سا ہوتا کہ یہ کردار جانا پہچانا ہے لیکن اُس کی زندگی کے معمولات یکسر فراموش ہو چکے ہوتے ہیں.. گارسیا کے اس مجموعے میں ''ایک دن ہفتے کے بعد'' والی کہانی میں سراسر بُھلا چکا تھا.. اس میں بھی گارسیا کی جادوئی حقیقت پسندی کی سحر انگیزی اپنے عروج پر ہے..

جانے کن خطّوں میں کہیں ایک ویران، بے رُوح زوال پذیر قصبہ ہے جس کے بھائیں بھائیں کرتے ریلوے اسٹیشن پر دن میں ایک بار کہیں سے ایک گاڑی آ رُکتی ہے لیکن ایک مدت سے وہاں کوئی مسافر نہیں اترا.. گاڑی رُکتی ہے اور چلی جاتی ہے.. کدھر سے آتی ہے کہاں جاتی ہے کچھ واضح نہیں.. لیکن گاڑی معینہ وقت پر آتی ہے، رُکتی ہے اور اُس میں سے کوئی مسافر نہیں اترتا اور وہ چلی جاتی ہے.. ''سو برس کی تنہائی'' کے سب آثار اس

ویران قصبے کے بام و در پر اترے ہوئے ہیں، حبس آلود شدید گرمی جس میں سانس بھی رک رک کر آتا ہے.. پھر ایک عجیب وقوعہ ظہور پذیر ہوتا ہے. آسمان سے مُردہ پرندے گرنے لگتے ہیں. گھروں کے برآمدوں میں، ویران دھوپ میں سلگتی سڑکوں پر، پارکوں میں، یہاں تک کہ گاؤں کے واحد کلیسا کے اندر بھی مُردہ پرندے پائے جاتے ہیں. کلیسا کا پادری سو برس کا ہو چکا ہے، حواس باختہ ہے اور وہ دعوے کرتا ہے کہ میں نے ان دنوں تین بار شیطان کو دیکھا ہے.. کسی بھی مکین کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر پرندے آسمان سے مُردہ حالت میں ان کے قصبے پر کیسے گر رہے ہیں..

میں نے اس کہانی کا آخری حصّہ پڑھا تو تحیّر بھرے ڈر میں مبتلا ہو گیا اور بہت دیر تک اپنے صوفے پر ایک مُردہ پرندے کی طرح بے حس پڑا رہا..

میرے قدموں میں بھی ایک کبوتر، ایک فاقہ زدہ کبوتر مردہ حالت میں آ گرا تھا..

داتا صاحب کے صحن میں بھی مردہ پرندے گرتے رہتے تھے..

تو کیا گارسیا مارکیز نے اپنی کہانی "ایک دن ہفتے کے بعد" میں میرے شہر کے مردہ مستقبل کی ہی پیش گوئی کی تھی.. کہ وہ ویران اور بے رُوح قصبہ جو شدت کے حبس میں دم روکتا تھا اور جس کے سٹیشن پر دن میں ایک گاڑی رُکتی تھی اور ایک مدت سے وہاں کوئی مسافر نہ اترا تھا اور جہاں آسمان سے مُردہ پرندے گرنے لگے تھے اور میرا شہر ایک ہی ہیں.. جیسے البرٹ کامیو میرا پڑوسی ہو سکتا ہے ایسے کیا پتہ داتا صاحب کے صحن میں ایک گٹھڑی کی مانند پڑا، مُردہ بیر بہوٹیوں ایسی آنکھوں والا شخص، گارسیا مارکیز ہو.. وہ اپنی جادوئی حقیقت پسندی کے معجزے سے مرنے کے بعد بھی داتا صاحب کے صحن میں موجود ہو سکتا تھا.. وبا کے دنوں میں کُچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا..

پرندوں کی بات چل نکلی ہے تو میں آپ کو کسی مردہ پرندے کی نہیں ایک
چُوں چُوں کرتی چڑیا کی کہانی سنانا چاہتا ہوں..

ایک ایسی کہانی جو آپ نے کبھی نہ سُنی ہوگی کہ اس سے پیشتر نہ کبھی ایسے وبا کے
دن آئے اور نہ ہی ایسی چڑیا آئی جو چُوں چُوں چِر چِر کرتی ایک ایسے مقام پر تھی جہاں اُس
کے نہیں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں..

وہ ایک عام سی چڑیا ہے جو کہ خاص ہوگئی تھی..

جیسے ہمارے ہاں کی بھوری عام سی چڑیاں ہوتی ہیں، ویسی ایک چڑیا جس کا رنگ
رُوپ ہماری چڑیوں سے جُدا ہے کہ اُس پر اُس شہر اور اُس کے موسموں کا اثر ہے..اُس کے
سر کے باریک پَر سیاہی مائل ہیں اور بقیہ بدن سلیٹی رنگ کا ہے..

دور تک مسجد نبوی کے دبیز ستون قطار اندر قطار چُپ کھڑے ہیں اور سناٹے
ہیں آئے ہوئے فانوس روشن ہیں..اور دور تک گھاس کی رنگت کا ایک منقش قالین بچھتا چلا
جا رہا ہے جس کے حاشیے پر سیاہ رنگ کی زیبائشیں خاموشی میں خوش نظر ہیں..

پوری مسجد نبوی جہاں تک نظر جاتی ہے، ویران ہے، ویران ہے..

ستونوں کی بنیادوں کے گرد سنہری رنگ کی بناوٹیں ہیں، جو فانوسوں کی روشنی میں یوں دکتی ہیں جیسے ستونوں نے سنہری انگوٹھیاں پہن رکھی ہوں..

بائیں جانب اصحاب صفہ کا تھڑا بھائیں بھائیں کر رہا ہے، کوئی ویرانی سی ویرانی ہے لیکن یہ بھی عام سی ویرانی نہیں. کسی دشت کی، کسی شہر کی یا کسی نامراد دل کی ویرانی نہیں ہے.. مسجد نبوی کی ویرانی ہے جس میں دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام.. ایسی ویرانی کہ کائنات کی سب رونقیں اس میں سانس لیتی محسوس ہوتی ہیں..

یہ ریاض الجنہ کے حصّے میں بچھا ہوا گھاس رنگت کا قالین ہے جس کی بُنت کے ہر دھاگے کے سُوت کا ہر ذرّہ جبیں آشنا ہے، ہر ذرّے میں لاکھوں جبینوں کا عشق سرائت کر کے اُسے آفتاب بناتا ہے..

ویڈیو کا منظر کُھلتا ہے اور جہاں تک آنکھ دیکھے وہاں تک نہ کوئی بندہ، البتہ ایک پرندہ!

دائیں جانب ایک وہیل چیئر پر براجمان کوئی شخص رانوں پر ہاتھ جمائے بیٹھا ہے لیکن اُس کا چہرہ کیمرے کی زد میں نہیں آتا.. صرف آبنوسی رنگت کے دو مضبوط ہاتھ ہیں، بائیں ہاتھ کی شہادت کی اُنگلی میں لَو دیتے ہوئے سبز رنگ کے پتھر کی ایک انگوٹھی ہے اور یہ بھی کوئی عام شخص نہیں، روضۂ رسولؐ کا سوڈانی چابی بردار ہے..

وہ اپنے رسول اللہؐ کو چھوڑ کر نہیں گیا جیسے ہزاروں برسوں سے اُس کے آباؤاجداد جن کے نصیب میں روضۂ رسولؐ کی چابیاں لکھ دی گئی تھیں وہ بھی ہمہ وقت حاضر

رہے، کسی وبا، کسی بلا کے خوف سے ہراساں ہو کر اس در کی نگہبانی سے دستبردار نہ ہوئے۔
یہ ویڈیو چابی بردار کے ایک نوجوان نائب کے سیل فون سے اتری ہوئی تھی، اور تلقین کی گئی تھی کہ اسے عام نہ کیا جائے..
یہ مُجھ تک وبا کے دنوں میں پہنچ گئی..

اس ویڈیو کو دیکھنا بہت دشوار ہے، ذرا دیکھا، پہلی بار آنکھ جھپکی تو منظر کے آگے نمی کا ایک پردہ جھلملانے لگا، اسے برداشت کرنا آسان نہیں، دم رُک رُک جاتا ہے۔ وہ جس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا نظر اُس کے آبنوسی ہاتھوں سے نہیں ہٹتی..ہونٹ جاں کنی کے عالم میں مبتلا ایک تتلی کی مانند پھڑپھڑاتے ہیں اور اُن ہاتھوں پر ثبت ہو جانا چاہتے ہیں، ثبت ہو جائیں تو مرتی ہوئی تتلی زندہ ہو جائے، اُسے نئی حیات نصیب ہو جائے، اڑے اور اُس گنبد پر جا بیٹھے جس کی رنگت کی انگوٹھی آبنوسی اُنگلی میں دمکتی ہے..پھر خیال آتا ہے کہ یہ تو محض تصویروں کا تسلسل ہے..روضۂ رسولؐ کے کُنجی والے کے ہاتھ پر کہاں بوسہ دیا جا سکتا ہے..

پھر بائیں جانب سے، جانے کہاں سے ایک چڑیا نمودار ہوتی ہے، جس کے پر کے باریک پر سیاہی مائل ہیں اور بقیہ بدن سلیٹی رنگ کا ہے وہ ریاض الجنہ کے سبز قالین پر کبھی اطمینان سے چلتی ہے، کبھی پُھدکتی ہے، کبھی اِدھر اُدھر دیکھتی ہے اور وہاں تو اور کوئی نہیں پُوری مسجد نبوی میں سوائے چابی بردار کے ہاتھوں کے..اُسے چین نہیں آ رہا، وہ جانے کس بَن کی چڑیا ہے، جانے اُس نے یہاں پہنچنے کے لئے کیسے کیسے کشٹ کاٹے، کہاں کہاں اڑتی پھری اور جانے کس نے مسجد نبوی کا ایک روزن کُھلا رہنے دیا جس کے راستے وہ اندر

داخل ہوگئی.. وبا کے دنوں میں مسجد نبوی میں ایک دل روکنے والا سکوت طاری ہے اور اُس سکوت میں اور سکوت بھی روضۂ رسولؐ کی ہمسائیگی کا، وہ چُپ تو نہیں رہتی، چُوں چُوں کرتی چہکتی جاتی ہے.. چابی بردار کی موجودگی سے بے خبر سبز قالین پر اتنی بڑی تنہائی میں وہ کبھی چلتی ہے، کبھی سینہ پُھلا کر حیرت سے اِدھر اُدھر تکتی ٹھہر جاتی ہے.. زیادہ دیر چُپ نہیں رہتی.. پھر سے چہکنے لگتی ہے چُوں چُوں کی آوازیں نکالنے لگتی ہے.. وہ کیا کہتی ہے، کس سے کہتی ہے، اُس کی چہک میں بھی تو کوئی کلام ہے.. شائد اپنے نصیب پہ نازاں نازاں چُوں چُوں کرتی ہے.. کون ہے جو اُس کا کلام سمجھ پائے.. جانے کس سے کیا کہہ رہی ہے.. کُچھ نہ کچھ تو کہہ رہی ہے..

ے ننھی چونچ یہ چُوں چِرچُوں چِرچُوں کی، چنچل بانی
کرن کرن پر ناچ رہی ہے اُس کے من کی کہانی
کیا گاتی ہے، کیا کہتی ہے، کون اس بھید کو کھولے؟
جانے دُور کے کس ان دیکھے دیس کی بولی بولے
گانے والی چڑیا اپنا راگ الاپے جائے☆

اس ویڈیو کی نایاب سحر انگیزی میں کُچھ شک نہ تھا.. میں نے اسے بار بار دیکھا، اتنی بار دیکھا، ایک خواب تھا جو بار بار دیکھا یہاں تک کہ میں مبتلا ہوا اس خواب میں ایسے کہ مُجھے گمان گزرتے گئے کہ میں اُس چڑیا میں منتقل ہوگیا ہوں اور یہ میں ہوں مسجد نبویؐ

☆ مجید امجد

کے خلائی سکوت میں، اُس گھاس رنگت کے قالین کے گُل بُوٹوں پر چہکتا چوں چوں کرتی عجب بولیاں بولتا یہ میں ہوں.. اور اُس آبنوسی رنگت کے چابی بردار کو بھی کچھ شک نہیں ہے کہ اُس کے آس پاس جو چڑیا چوکتی پھرتی ہے، اِک نازاں نازاں نزاکت میں، وہ چڑیا نہیں، میں ہوں.. اور نہ ہی وہ چابی دار آگاہ ہے کہ اس چڑیا کی چونچ کا رُخ تو اُس آنسو نما سنہری بوند کی جانب ہے. جس کے اندر وہ آتشِ گل ہے. جس سے میری حیات کا چمن دہک رہا ہے.. اور اس چڑیا کی نیت کُچھ اچھی نہیں، اِس نے چوری چھپے اس سنہری بوند کے اندر داخل ہو جانا ہے، چونچ سے دستک بھی نہیں دینی، چور جو ہے.. اور اس کا کُچھ ارادہ نہیں واپس آنے کا، اس نے سنہری بوند کے اندر جو آتشِ گُل دہکتی ہے اُس پر نثار ہو جانا ہے تا کہ اُس کی راکھ کا کوئی ذرّہ تو اُس تک پہنچے، اُسے خبر تو ہو جائے.. میری نیت سے وہ بے خبر ہے جو سبز پتھر کی انگوٹھی پہنے بیٹھا ہے، خبر ہوتی تو یقیناً مُجھے شُو شُو کر کے اڑا دیتا..

یہ چڑیا ہے یا میں ہوں.. شائد میں ہوں جو چڑیا میں منتقل ہو چکا ہوں یا پھر چڑیا ہے جو مُجھ میں منتقل ہو چکی ہے..

تو کس دھیان میں تَیری، چڑیا، اے ری چڑیا<br>
(تو میں کس دھیان میں تَیرا، چڑیا، اے ری چڑیا)<br>
بھولی، تو یوں اڑتی، پنکھ جھپکتی<br>
یہاں کہاں آٹھیری، چڑیا، اے ری چڑیا

عین ممکن ہے کہ میرے اس بیانئے سے ایک غلط فہمی جنم لے چکی ہو کہ داتا صاحب کے ہاں حاضری کی پاداش میں مُجھ پر جو مکمل تنہائی لاگو ہو چکی ہے تو میں باہر کی دنیا سے مکمل طور پر منقطع ہو چکا ہوں.. جب کہ ایسا نہیں ہے..

جس طور دستک دے کر مُجھے خوراک مہیا کر دی جاتی ہے اسی طرح تازہ اخبار بھی میرے دروازے کے باہر ڈیٹول سے سپرے شدہ حالت میں موجود ہوتا ہے.. میرا سیل فون بھی مُجھے باہر کی دنیا سے جوڑے رکھتا ہے.. میں اتنا بھی منقطع نہیں ہو چکا..

وبا برازیل کے اُن ایمزان جنگلوں میں بھی پہنچ چکی ہے جن کے گھنے پن کے اندر سورج کی روشنی بھی پہنچ نہ پائی تھی اور وہاں آباد آبائی قبائل اس کا شکار ہو رہے ہیں یہاں تک کہ اُن کی نسلیں سراسر معدوم ہو جانے کا خدشہ بھی سر اٹھا رہا ہے..

جیسے کسی ہٹ فلم کی سکریننگ پر سینما کے باہر "ہاؤس فُل" کا بورڈ آویزاں کر دیا جاتا ہے ایسے نیویارک کے مردہ خانوں کے باہر بھی "ہاؤس فُل" کے اعلان نظر آ رہے ہیں. لاشوں کو اُن ایئر کنڈیشنڈ ٹریلروں میں محفوظ کیا جا رہا ہے جو عام حالات میں گوشت کے

لیے مخصوص ہوا کرتے تھے..

اخبار میں شائع شدہ ہر تصویر کو دیکھ کر خوف آتا ہے. چاہے وہ عمارتیں ہوں یا لوگوں کا کوئی اجتماع، جیسے ان تصویروں کے اتارنے والے کیمروں میں خوف بھر دیا گیا ہو

ایک تصویر ہے.. کراچی میں رات کا کوئی پہر ہے.. ایک نیم روشن ویران سڑک ہے کچھ بلیاں ہیں، اگرچہ بلیاں ہیں لیکن وہ ایک ایسی نیم مُردنی میں مبتلا ہیں کہ کوئی ان دیکھا ایسا جانور لگتی ہیں جو پہلی بار انسانی آبادی میں آ نکلا ہو، اور وہاں انسان بھی نہیں ہیں..

صرف اُن کی آنکھیں ہیں جو انگاروں کی مانند سلگتی ہیں اور اُن میں بھوک ہے، وہ کسی حد تک لاغر دکھائی دیتی ہیں. اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہولے ہولے غرّا رہی ہیں، رو رہی ہیں جیسے اُن کے بچے مر گئے ہوں..

ان میں سے کچھ مر چکی ہوں گی.. یہ بھوکی فاقہ زدہ بلیاں ہیں.. وہ ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جہاں کوڑے کے ڈھیر ہوا کرتے تھے کاٹھ کباڑ کے انبار ہوا کرتے تھے اور اُن میں اُن کے شکم کے لئے وافر بچی کھچی خوراک ہوا کرتی تھی تو وہ سب کہاں گئے.. کراچی اتنا صاف ستھرا شہر تو کبھی نہ تھا..

ان میں سے کچھ یقیناً بھوک سے مر گئی ہوں گی..

وہ کبوتر نہیں ہیں کہ آسمان سے گریں اور مر جائیں.. گارسیا کی کہانی کے آسمان سے گرتے مردہ پرندے نہیں ہیں.. اس لئے اُن کے مرنے کی کسی کو خبر نہیں ہوئی خبر نہ ہونے کی ایک اور توجیہہ بھی ہے.. جانور کے اندر ایک قدیم حس اُن زمانوں سے چلی آتی ہے جب وہ جنگل میں حیات کرتا تھا، وہ اپنی موت کی آمد کی بو سونگھ لیتا ہے.. اور کبھی بر سرِ عام

اپنے ہم جنسوں کی موجودگی میں مرنا نہیں چاہتا.. اُسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وقت آن پہنچا اور وہ اپنے آپ کو الگ کر لیتا ہے، کسی گھنی جھاڑی میں یا کسی ویرانے میں اپنے آپ کو روپوش کر لیتا ہے اور مر جاتا ہے.. بلیاں بھی روپوش ہو کر تنہائی میں کہیں مر گئی ہوں گی اس لئے اُن کی موت کی خبر نہ ہوئی..

مجھے ان دنوں یہی محسوس ہو رہا ہے کہ انسانوں نے بھی موت کی بُو سونگھ لی ہے سب سے الگ ہو گئے ہیں، دیگر انسانوں سے دور ہو کر، اپنی ذاتی آماجگاہوں میں پوشیدہ ہو کر تنہائی کی ایک موت کے منتظر ہو گئے ہیں. ان دنوں سب کے چہروں پر ڈر کی جو پرچھائیاں گزرتی جاتی ہیں اُس کا سبب بھی یہی ہے کہ وہ فنا کو اپنی جانب رینگتے محسوس کر رہے ہیں، انسانوں کے اندر بھی وہ حیوانی حِس بیدار ہو گئی ہے جو کب کی مفقود ہو چکی تھی.. اُنہیں بھی موت کی بُو آ رہی ہے..

کیا وہ بلیّاں، بھوکی بلیّاں جو ہولے ہولے غرّاتی ہیں اس وبا سے جانبر ہو سکیں گی.. ہو سکیں گی تب جب انسان کو اس سے نجات ملے گی ورنہ ان وقتوں میں انسان اور حیوان ایک ہی پلڑے میں تُل گئے ہیں. دونوں نے موت کی بُو سونگھ لی ہے.. مُجھ پر بھی کُچھ اثر سا ہوتا جاتا ہے.. گمان ہوتا ہے کہ میرے آس پاس بھی کوئی ایسی نامعلوم سی بُو ہے جس سے کبھی شناسائی نہیں رہی، اور بدن میں ایک ہلکی سی بخار آلود کیفیت کا وہم ہے جسے میں جڑیں پکڑنے نہیں دیتا، خصوصی طور پر سرِ شام کُچھ حدّت سی محسوس ہوتی ہے جو کہ وہم اور سہم کے سوا کُچھ بھی نہیں.. جب دن رات آپ کو کرونا کی علامات کے لیکچر دیئے جاتے ہیں تو خواہ مخواہ آپ کو شک ہونے لگتا ہے.. شک کے سوا کُچھ بھی نہیں.. میں بڑی آسانی سے اپنے

ڈیجیٹل تھرمامیٹر کو ماتھے پر دائیں بائیں پھیر کر اپنے اس شک کو رفع کرسکتا ہوں.. اگر کچھ حدت ہے تو وہ اس کی مختصر سکرین پر ہندسوں کی صورت میں نمایاں ہو جائے گی لیکن میں گریز کرتا ہوں.. نہ صرف میرے بچوں نے مجھے وبا سے بچانے کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کر رکھی ہیں بلکہ میں بھی اس معاملے میں حد درجہ احتیاط پسند ہو چکا ہوں تو مجھے کچھ خدشہ لاحق نہیں.

یوں بھی ڈیجیٹل تھرمامیٹرز پر کلی طور پر انحصار نہیں کیا جاسکتا.. اپنے آپ کو شک میں ڈالنے سے فائدہ..

داتا صاحب کی برکت سے آج میری تنہائی کا آٹھواں دن ہے..

میں پرندوں کی آمد کا ایسی بیتابی سے منتظر ہوتا ہوں جیسے کسی غیر معروف فراموش شدہ جزیرے میں پھنس چکا کوئی ملاح کسی کشتی کی راہ دیکھتا ہے.

بیدار ہونے پر میں نہائت اشتیاق سے کھڑکی کے پردے کھینچ کر منڈیر کو دیکھتا ہوں اور وہاں اکثر کوئی نہ کوئی پرندہ موجود ہوتا ہے.

وہ پرندہ ایک ایسی ڈوری ہوتی ہے جو مُجھے باہر کی دنیا سے باندھے رکھتی ہے اور میں اُس کی اچھل کُود اور اِترا اِترا کر چلنے کی اداؤں کو ایسے تکتا جاتا ہوں جیسے وہ کوئی خوش بدن جمناسٹ لڑکی ہو.. میں اپنی بصارت کو ایک ہی نکتے پر مرکوز کر کے اُس نکتے میں اُس پرندے کو تصویر کر کے دیکھتا جاتا ہوں.. اتنے گہرے ارتکاز کے کُچھ لمحوں بعد مُجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ میرے اتنے قریب آ چکا ہے کہ میں اُسے ہاتھ لگا سکتا ہوں، جیسے وہ کھڑکی کے شیشے کو پار کر کے میرے کمرے میں چلا آیا ہے اور میری میز پر آ بیٹھا ہے، اتنا قریب کہ میں اُس کی متجسس آنکھوں میں جھانک سکتا ہوں.. اور تب دروازے پر دستک ہوتی ہے.. بابا جان ناشتہ.. اور وہ ٹھٹک کر یکدم مُجھ سے دور ہو جاتا ہے، منڈیر پر واپس چلا

جاتا ہے..

آج بھی بیدار ہونے پر میں نے سب سے پہلے کھڑکی کے پردے ہٹائے..
میرے دل میں کھد بد ہوئی کہ دیکھیں آج میری آنگن منڈیر پر کونسا پرندہ مہمان بن کر اترا ہے..منڈیر سج جائے گی، آباد ہو جائے گی.

اور وہاں ایک بدرنگ کریہہ شکل والی چیل بیٹھی تھی.

وہ کبھی کبھی اپنے نیم سیاہ چوڑے پَر پھیلاتی جیسے اڑ جانے کو ہے اور پھر انہیں پھڑپھڑا کر سمیٹ لیتی..

میری منڈیر پر آج تک کوئی چیل نہیں بیٹھی تھی..

چیلیں عام طور خالی آسمان پر معلّق سی نظر آتی رہتی ہیں، جیسے تھم گئی ہوں..نیچے اترتی ہیں تو کبھی کسی ایسے مقام کا انتخاب نہیں کرتیں جہاں آس پاس کُچھ شجر ہوں اور اُن کے پروں کے اُلجھ جانے کا امکان ہو..

تو یہ چیل کدھر سے آ گئی..

وہ ایک لاتعلق حالت میں بیٹھی ہوئی تھی جیسے وہ کھڑکی کے شیشے کے پیچھے جھانکتے میرے بوڑھے چہرے کی موجودگی سے یکسر بے خبر ہو.. بُت بنی بیٹھی تھی.. مُجھے اُن کی چُوں چُوں اور چہک مہک کی آوازوں سے اندازہ ہوا کہ قریبی درختوں کی شاخوں میں چھپے ہوئے کچھ پرندے ہیں جو منڈیر پر اترنے کے لئے آئے تھے اور اس چیل کو وہاں براجمان دیکھ کر ارادہ ترک کر رہے ہیں..اس چیل کی آمد نے ہر سُو ایک نحوست پھیلا دی تھی..

چیل کی وہاں موجودگی مجھے بے آرام کر رہی تھی..ایک انجانا سا ڈر میرے بدن کے مساموں سے پسینے کی مانند پھوٹنے لگا..حالانکہ میں اپنے کمرے میں محفوظ تھا، وہ مجھے گزند تو نہیں پہنچا سکتی تھی تو پھر اس ڈر کا جواز کیا تھا..

کہیں یہ گدھ تو نہیں..

ان دونوں میں کچھ فرق تو ہوتا ہے..گدھ کی چونچ مڑی ہوئی تیز دھار ہوتی ہے اور وہ حجم میں چیل سے بڑا ہوتا ہے..چیل ہی تھی..

معاً گئے زمانوں کے دھندلکوں میں سے ایک ٹنڈ منڈ شجر کی سوکھی ہوئی شاخیں ظاہر ہونے لگیں، پھیلتی گئیں..افریقہ کے کسی دور افتادہ ویرانے میں گریگوری پیک ایک خاکی رنگ کے خیمے کے اندر زخموں سے کراہ رہا ہے..راتوں کو لگڑ بگڑ اُس خیمے کے گرد منڈلاتے اُسے سونگھتے ہیں، یوں غراتے ہیں جیسے ہنس رہے ہوں اور اُن میں سے ایک خیمے کے اندر داخل ہو کر گریگوری پیک کی پٹیوں میں لپٹی ٹانگ کے ناسوردار سڑے ہوئے گوشت کو سونگھتا ہے اور اُس کی چیخ و پکار سُن کر ایک افریقی خادم آتا ہے اور لگڑ بگڑ کو بھگا دیتا ہے.ہمینگوے کی ''سنوز آف کلی منجاروز'' میں گریگوری پیک قریب المرگ اُس پنکھوں والے جہاز کی آمد کا منتظر ہے جو کبھی آئے گا اور اُسے تہذیب کی جانب لے جائے گا اور وہ صحت مند ہو جائے گا.

خیمے کے قریب جھاڑیوں سے پرے ایک ٹنڈ منڈ درخت جس کی شاخیں خالی ہیں..ایک سویر گریگوری پیک خیمے کا پردہ اٹھا کر دیکھتا ہے تو اُس پر چند گدھ بیٹھے ہوئے ہیں.وہ جان جاتا ہے کہ گدھ تبھی اترتے ہیں جب کوئی جانور قریب المرگ ہو، اُس کے مردہ بدن کو نوچنے اور نگلنے کے لئے آتے ہیں..اُنہوں نے اُس کی موت کی بُو سونگھ لی تھی..

کہیں اس چیل نے بھی میری موت کی بُو تو نہیں سونگھ لی..

چیلیں بھی تو مردار کھاتی ہیں..

وبا کے ان دنوں میں یہ بھی تو بھُوکی ہو سکتی ہیں..

میرے تن بدن میں جان نہ رہی تھی..

میں نے کھڑکی کا پردہ پھر سے برابر کر دیا اور صُوفے پر نڈھال ہو کر گر گیا..اس باہر منڈیر پر بیٹھی چیل کی آمد میں جو مرگ سندیسہ تھا اُسے میں نے بہت محسوس کیا اور یہ بخار تو نہ تھا خوف تھا جو میرے بدن کو حدّت آلود کر رہا تھا..

عُمر کے اسفار سے ڈھیلے پڑ چکے اعضاء تھے جو ایک خفیف سی حدّت محسوس کر رہے تھے..بخار تو نہ تھا..

اب تو بہت زمانے بیت گئے جب مجھے یکدم یوگا سے شغف ہو گیا تھا۔ یوگا کی مشقیں جب تک کسی گورو کی زیر نگرانی اور اُس کی ہدایات پر سختی سے عمل کرتے ہوئے اختیار نہ کی جائیں تو یہ قدیم ورزش آپ کے بدن کو صحت مند بنانے کی بجائے اُس کے نظام کے لئے مضر بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔۔میں اکثر پارک کے کسی دور دراز گوشے میں ایک صاحب کو سر کے بل ایستادہ دیکھا کرتا تھا اور دور سے یوں لگتا تھا جیسے کوئی شجر اُلٹا دیا گیا ہے اور اُس کی جڑیں ٹانگوں کی صورت دکھائی دے رہی ہیں۔۔وہ میری ہی عُمر کے کوئی وکیل تھے جن کی وکالت شائد نہیں چلتی تھی ورنہ وہ دھوپ چڑھے تک دونوں ہتھیلیوں پر سر جمائے دیر تک وہاں معلّق دکھائی نہ دیتے، وہ طبیعت کے قدرے کُھردرے تھے، مردم بیزار تھے لیکن میں نے منت سماجت کر کے اُنہیں یوگا کی چند مشقیں سکھانے پر آمادہ کر ہی لیا۔۔

میں نے ایک فرمانبردار چیلے کی مانند اس گورو سے یوگا کی کُچھ مشقیں سیکھیں جن کے نتیجے میں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ صرف میرا بدن میں لچک پیدا ہو گئی بلکہ میری بینائی بھی بہتر ہو گئی اور حیرت در حیرت منظروں کے رنگ کہیں شوخ نظر آنے لگے جیسے مصوّر نے

ابھی ابھی وہ منظر پینٹ کیا ہو..

لیکن یوگا کا اصل کرشمہ ارتکاز کا عمل ہے.. آپ اپنے بدن کو ڈھیلا اور ڈھیلا کر دیجئے اور پھر ذہن میں سے ہر خیال خارج کر کے کسی بھی شے پر اپنی آنکھیں مرکوز کر دیں، آنکھوں اور توجہ کو بھٹکنے نہ دیں اُس شے کو دیکھتے جائیں. اگر آپ یہ عمل اپنے آپ کو گہرے انہماک کے سپرد کر کے جاری رکھتے ہیں تو عین ممکن ہے کہ آپ اُس شے کے اندرون میں سفر کر جائیں اور یہ ایک عجیب سحر انگیز ان دیکھی دنیا ہوگی. مثلاً آپ پوری توجہ سے اپنے ذہن کو خالی کر کے کسی شجر پر اپنی آنکھیں مرکوز رکھیں تو وہ لمحہ آ سکتا ہے جب آپ اُس شجر کے اندر داخل ہو جائیں گے یا وہ شجر قریب ہوتا آپ کے اندر منتقل ہو جائے گا..

ارتکاز کی یہی مشق صوفیاء کرام اور مجذوب لوگوں کے لئے ایک بڑی سچائی تک پہنچنے اور اُس میں مدغم ہونے کا وسیلہ بنتی ہے... اس کے لئے موم بتی کا شعلہ بھی معاون ثابت ہوتا ہے، آپ اُس پر اپنی آنکھیں مرکوز کر کے کسی اور جہان سے آگاہ ہو سکتے ہیں.. مہاتما بدھ کے بیشتر مجسّموں میں آپ ارتکاز کی یہی کیفیت مجسّم دیکھیں گے، اگرچہ وہ ظاہر کی بجائے باطن سے رجوع کر جاتے ہیں.. یوگا کی یہ تقریباً فراموش شدہ مشق وبا کے دنوں کی تنہائی میں میرے بہت کام آئی.. یہ اختیاری تنہائی کاٹنے کے دوران چونکہ آپ کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا چنانچہ کمرے میں جو کچھ بھی موجود ہوتا ہے آپ اُس میں سے کسی ایک شے کا چناؤ کر کے اُس پر ارتکاز کر جاتے ہیں، مسلسل دیکھتے چلے جاتے ہیں، توجہ بھٹکنے نہیں دیتے، نظر جمائے رہتے ہیں اور پھر ممکن ہے کہ آپ اُس حالت میں چلے جائیں جہاں آپ کو وہ کچھ نظر آنے لگے جو پہلے دیکھا نہیں ہوا، جو عام آنکھ سے اوجھل اپنے آپ

میں پوشیدہ ہوتا ہے..

مثلاً آج صبح ناشتے کے بعد میں نے یہ عمل کیا.. میں نے میز پر رکھے اپنے سیاہ رنگ کے پیلی کن پین کو اپنی نگاہوں کا مرکز بنا لیا.. ظاہر ہے اس دوران میری آنکھیں تھکاوٹ سے بھاری ہو جاتی تھیں لیکن میں انہیں پین سے ہٹاتا نہیں تھا کہ اگر ایک بار نظر بھٹک جائے تو ارتکاز کا بینائی سے تخلیق ہوتا جام کرچی کرچی ہو جاتا تھا اور اُسے دوبارہ شکل دینا ناممکن ہو جاتا تھا.. اکثر ایسا ہو بھی جاتا تھا اور مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا تھا.. لیکن آج اتنی یکسوئی حاصل ہو گئی کہ میں ارتکاز سے ایک لمحے کے لئے بھی نہ بھٹکا، میری آنکھیں تادیر پین کی بناوٹ پر مرکوز رہیں اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اُس کے سیاہ وجود کے قریب ہو رہا ہوں، اُس کی نِب کے نواح میں سانس لے رہا ہوں اور اُس لمحے اپنے سانس کو قابو میں رکھنا اور ایک ہی ہموار سطح پر قائم رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے.. کچھ دیر بعد آپ شائد یقین نہ کریں کہ نِب میں سے روشنائی یُوں پھوٹنے لگی جیسے دریا کنارے کی ریت دبانے سے اُس میں سے نمی پھُوٹتی ہے اور یہ روشنائی کسی ناشناسا زبان کے حروف لکھتی جاتی ہے جن کا مفہوم سمجھنے سے میں قاصر تھا.. کیا یہ دنیا کا وہ پہلا رسم الخط تھا تو سُمیرین تہذیب کی مٹی کی تختیوں پر نقش تھا یا کوئی ایسی زبان جو آئندہ زمانوں میں ایجاد ہو گی، میں حرفوں کی اس عجیب کائنات میں سفر کر رہا تھا اور وہ حرف میرے آس پاس سیاروں کی مانند گھومتے چلے جاتے تھے جب یکدم دروازے پر دستک ہوئی.. "بابا.. کھانا.."

ظاہر ہے اُس دستک نے ناشناسا حرفوں کے اس انجانے طلسم کو چکنا چُور کر دیا.. میز پر رکھا پیلی کن کا سیاہ پین پھر سے اپنی ہیئت میں چلا گیا.. نِب کی نوک بنجر ہو گئی.. لیکن

میں حرفوں کے جس جہان میں اترا تھا وہ مکمل طور پر معدوم نہ ہوا۔ نب کی نوک میں سے پھوٹتی روشنائی نے جو کچھ رقم کیا تھا اُس کے شائبے میرے اندر منتقل ہو کر محفوظ ہو گئے۔ میں کبھی نہ کبھی ان حروف کو پھر سے دریافت کروں گا اور ڈی سائفر کرنے کی بھرپور کوشش کروں گا تاکہ کچھ تو سراغ ملے یہ کہاں سے آئے تھے اور ان میں کونسے مفاہیم پنہاں تھے۔

میں جب اس ارتکازی کیفیت سے باہر آیا، میرا بدنی نظام نارمل ہوا تو مجھے واضح طور پر بخار کی حدت کا احساس ہوا..نہیں، یہ منڈیر پر چیل کی آمد کے خوف کا شاخسانہ نہ تھا. لیکن میں اس حقیقت کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا..میں ڈیجیٹل تھرمامیٹر کو ماتھے سے رگڑ کر جان تو سکتا تھا کہ کیا واقعی میں بخار میں مبتلا ہوں یا یہ میرا وہم ہے..لیکن میں حالت انکار میں مبتلا رہا..بخار نہیں، وہم ہے..

''برڈ مین آف ال کٹراز'' تو برسوں ایک کوٹھڑی میں بند رہا اور مسلسل پرندوں پر تحقیق کرتا رہا تو میں پرندہ شناسی میں اُس کا ہم پلّہ تو نہیں ہو سکتا لیکن میں نے ایک مختصر مدت میں زیادہ تر مشاہدے کی قوت سے پاکستانی پرندوں کی نسلوں، اقسام اور اُن کی عادتوں پر خاصا عبور حاصل کر لیا ہے..

مثلاً ایک روز منڈیر پر ایک کبوتر اترا، دھم سے مُردہ حالت میں گرا نہیں بلکہ نہائت آہستگی سے پنجوں کے بل یوں اترا جیسے کوئی عادی چور کسی چھت پر بے آواز اترتا ہے..

اور یہ سلیٹی رنگت کے عام سا کبوتر نہ تھا، آپ یقین نہیں کریں گے کہ اس کے

رنگ نرالے تھے، سبز رنگ کا تھا. اتنا سبز کہ پہلی نظر میں وہ مجھے ایک ہریل طوطا لگا. اور سبز رنگ کی مناسبت سے اُس کا نام بھی ہریل ہی ہے. نہائت نفیس طبع پرندہ ہے، کوئی بدبودار شے نہیں کھاتا، درختوں سے نیچے کم ہی آتا ہے. اس کی نفاست کے بارے میں ایک مبالغہ مشہور ہے کہ جب کبھی وہ درختوں سے نیچے آتا ہے تو اپنی چونچ میں ایک ہری بھری شاخ لے کر آتا ہے، اُسے زمین پر رکھ کر پھر اُس پر براجمان ہوتا ہے. یعنی نخرِیلے پن کی ادا ایسی کہ اُسے کبوتروں کی امراؤ جان ادا کہہ لیجئے..

ایک آواز جو ہمیشہ مجھے بچپن کے ان دنوں میں منتقل کر دیتی ہے جب گاؤں کی شکر دوپہر میں دور سے آنے والی آٹا پیسنے والی چکی کی ''ٹک ٹک'' سنائی دیا کرتی تھی. اسی نوعیت کی آواز ایک دل کش رنگوں والا پرندہ لکڑ ٹُک نکالتا ہے.. یہ درختوں کے تنوں کی لکڑی کو ٹکتا ہے یعنی اُس میں سوراخ کر کے اُس میں رہائش اختیار کرتا ہے اور جب مُوڈ میں آتا ہے تو مسلسل ''ٹک ٹک'' کا ورد شروع کر دیتا ہے.. لکڑ ٹُک صرف ایک بار منڈیر پر نظر آیا، پھر ایسا گیا کہ مُڑ کر نہ آیا..

میں چمکیلے رنگوں کی گنگنانے والے پرندے یعنی ''ہمنگ برڈ'' کا تذکرہ کر چکا ہوں جو اپنی بدرنگ مادہ کے ساتھ میری بگن ولیا کی بیل کی گھناوٹ میں ایک مدت سے مقیم ہے. سون چڑیوں کے رنگوں کے بارے میں بھی آپ کو آگاہ کر چکا ہوں. ایک اور پُھرتیلا سا پرندہ ہے ''بی ایٹر'' نام کا جو ہمہ وقت ہوا میں اڑتے کیڑے مکوڑوں اور پتنگوں کا تعاقب کرتا رہتا ہے.. کیڑے کو چونچ میں دبوچ کر اُسے ہوا میں اچھالتا ہے اور نگل جاتا ہے.. یہ ''بی ایٹر'' کبھی میری منڈیر پر تو نہیں اترا لیکن میں نے اسے اکثر پتنگوں اور تتلیوں وغیرہ کا

تعاقب کرتے دیکھا ہے..

سب سے زیادہ دل آزار بھورے رنگ کی دیسی چڑیاں ہوتی ہیں جو ہمہ وقت چیختی چلاتی غُل کرتی رہتی ہیں، انہیں سہڑی کہا جاتا ہے اور ان کے بارے میں ایک دلچسپ حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ کبھی ان کے غول کی گنتی کیجئے تو اُن کی تعداد ہمیشہ سات کے لگ بھگ ہوتی ہے.

ہم لوگ تو صرف اپنی دیسی فاختہ سے آگاہ ہیں جو شکر دوپہر میں "یوسف ٹھوہ.. یوسف ٹھوہ" کوکتی پھرتی ہے اور سرمئی رنگت کی ہوتی ہے.لیکن پرندوں کی انسائیکلوپیڈیا میں درج ہے کہ اس کے علاوہ ایک اور فاختہ ہے جو پاکستان میں نہیں مشرق وسطیٰ کے ممالک میں پائی جاتی ہے..اس کے سیاہ پروں کے اوپر سفید رنگ کے نہائت خوش نظر دھبے ہوتے ہیں..

نہیں نہیں میرا دل نہیں لگ رہا..

اگر خواہ مخواہ پرندوں کے قصّے لے بیٹھا ہوں تو صرف اس لئے کہ میرا دھیان بٹا رہے.اُس طرف نہ جائے جس طرف بار بار جاتا ہے..میں اپنے آپ کو بہت انکار کے سراب میں مبتلا کرتا ہوں لیکن میرا بدن میرے خلاف گواہی دیتا ہے کہ اندر ایک سلگاہٹ جنم لے چکی ہے،ایک بخار آلود احساس نمو پا چکا ہے..

مجھے پیاس بھی محسوس ہو رہی ہے..

میں نے آج صُبح اپنے آپ کو فریب دے کر کہ یہ تو محض احتیاط ہے، پیناڈول کی دو گولیاں بھی نگلی تھیں..

کیا یہ وبا کی پہلی علامت ہے..

میرے گلے میں سوجن تو نہیں لیکن اپنا شک دور کرنے کی خاطر بار بار تھوک نگلنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہم ہونے لگتا ہے کہ شائد..

پرندوں کی باتیں میں صرف اپنی توجہ بھٹکانے کی خاطر کر رہا تھا جب کہ میری توجہ بار بار میز کے دراز پر رکھے ڈیجیٹل تھرمامیٹر کی جانب جاتی ہے. اگر واقعی یہ وبا کی پہلی علامت ثابت ہو گئی تو میں کیا کروں گا..

خوفزدہ ہو کر بچوں کو خبر کروں گا یا کمرے میں ہی اپنے راکھ ہو چکے انکار کے ڈھیر پر پڑا رہوں گا.

میں اُنہیں پریشان نہیں دیکھ سکتا.. میں اُنہیں اپنے نزدیک نہیں آنے دوں گا.. اگر یہ واقعی وبا کی علامت ہوئی تو میں اسے اپنے بچوں میں منتقل کر سکتا ہوں اور یہ تو میں کبھی نہ چاہوں گا.. پڑا رہوں گا..

عین ممکن ہے کہ یہ محض ایک وہم ہو تو اسے دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے.. کُچھ حرج نہیں.. چیک کر لیا جائے..

میری آنکھوں میں ابھی تک انکار کی پرچھائیاں تھیں لیکن ڈیجیٹل تھرمامیٹر کی سکرین پر نمایاں ہو چکے ہندسے اس انکار کو اقرار میں بدل رہے تھے.. بخار ایک سو دو درجے سے بھی تجاوز کر چکا تھا..

میں نے پردہ سرکا کے کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا ہے..

تازہ ہوا کے ساتھ اُن کی چہچہاٹوں کا شور بھی چلا آ رہا ہے.

حدت سے پھنکتے بدن کی سماعت میں عجیب شفافی اور کُھلا پن آ جاتا ہے..زیادہ سنائی دینے لگتا ہے. گمان ہوتا ہے کہ پرندوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے شائد وبا کی ویرانیوں اور خاموشیوں میں اُن کی نسلیں تیزی سے بڑھتی ہوں.. پرندوں کا بُلند آہنگ غُل گواہی دیتا تھا کہ وبا سے پہلے کی نسبت اب وہ بھی زیادہ ہو گئے ہیں..

ممکن ہے پرندوں کو بالآخر احساس ہو گیا ہو کہ اس دنیا میں انسان مفقود ہو رہے ہیں، وہ جو اُن کے بَیری تھے جنہوں نے اپنی ایجاد کردہ اشیاء کے استعمال سے ایک غیر قدرتی اور پرندہ آزار شوروغل تخلیق کیا تھا جس نے اُن کی حیات کے پُرزے کر دیئے تھے، وہ خوفزدہ حالت میں دبکے رہتے تھے تو وہ سب پُرزے پھر سے مجتمع ہونے لگے ہیں.. اُن کے بال و پر جو فضاؤں میں اڑتے پھرتے تھے اُن کے لئے وبا کی خاموشی اور ویرانہ پن ایک مرہم تھا، وہ پھر سے جُڑنے لگے تھے.. یہ خاموشی کیسا گھونسلا ہے کہ اس میں آسودگی اور

شانتی کا بسیرا ہے، یہ ویرانی کتنا بڑا گھر ہے جس پر اب اُن کا مکمل راج ہے..

آسمان کے بدن پر انسانوں کے بنائے ہوئے پرندوں کی گھن گھرج کی جتنی خراشیں تھیں وہ مندمل ہوتی جاتی تھیں..اُن کے کومل کانوں کو چیرنے والی سب آوازیں فنا میں اتر گئی تھیں..اس لئے وہ سب نکل آئے تھے اپنے گھونسلوں اور پناہ گاہوں سے اس لئے لگتا تھا کہ اُن کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا ہے..یہ بخار میں پھنکتے بدن کا واہمہ نہ تھا، پرندے بڑھ گئے تھے..

ویسے میں نے بہت دھیان کیا کہ آخر وہ اتنی بُلند آوازوں میں کیوں کُوک رہے ہیں، کیوں بے پناہ شور کر رہے ہیں تو مُجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا..یہ نئے پرندے تھے..یہ وہ نسل تھی جو وبا کے چُپ جہان کے سناٹے میں پیدا ہوئی..یہ جانتے ہی نہیں تھے کہ ایک زمانے میں ان ہواؤں میں کتنا بے ہنگم کانوں کے پردوں پر خراشیں ڈالنے والا شور ہوا کرتا تھا.جب اُن کے ماں باپ اُنہیں پُرانے زمانوں کے قصّے سناتے تھے کہ تب تو ہر سُو فضاؤں میں انسان کا تخلیق کردہ شور وغُل کا فُضلہ تیرتا پھرتا تھا، ہماری چہک اُس میں دفن ہو جاتی تھی، ہماری چونچیں کُھلی ہوتی تھیں اور اُن میں سے جو سُر کے ساگر بہتے تھے وہ اس شور کی ریت میں گم ہو جاتے تھے تو نئے پرندے ان قصّوں پر یقین نہ کرتے تھے.وہ سمجھتے تھے کہ ان بوڑھوں کا دماغ چل گیا ہے ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کبھی ان فضاؤں میں ایسا چیختا چلّاتا شور بھرا ہوتا تھا کہ اس میں پرندوں کے گیت بھی دفن ہو جاتے تھے..چنانچہ نئے پرندے گلے پھاڑ پھاڑ کر بولیاں بولتے تھے..جی بھر کے چہکتے تھے اور شفاف نتھری ہوئی فضاؤں میں اُن کی چہکاریں تیرتی پھرتی تھیں اسی لئے چہچہاہٹوں کا اتنا غدر برپا ہو گیا تھا..یہ نویں نکور آزاد

پرندے تھے جو وبا کی خاموشی کی کوکھ میں سے پیدا ہوئے تھے..

میں ہر چار گھنٹے کے بعد پیناڈول کی سفید گولیاں نگل لیتا ہوں لیکن کچھ افاقہ نہیں ہو پا رہا.. جیسے یہ گولیاں میرے رگ و پے میں بڑھاپے کے باعث آہستگی سے حرکت کرتے سرد خون میں گھلتی نہیں ہیں، اگر گھلتی ہیں تو حدّت میں کمی کے نہیں بلکہ شائد اضافے کا باعث بنتی ہیں.

مُجھے کُچھ اندازہ نہیں کہ میری کورنٹین کے دن کب پورے ہوں گے.. اگر پورے ہو چکے ہوتے تو یقیناً میرا بیٹا مُجھے اطلاع کر دیتا کہ بابا آپ کمرے سے باہر آنا چاہیں تو آ سکتے ہیں.. ویسے مُجھے اُس لمحے سے بھی خوف آ رہا ہے جب وہ دروازہ کھول کر بے دریغ میرے کمرے میں چلا آئے گا، وہ جان جائے گا کہ مُجھ پر وبا کا اثر ہو چکا ہے اور یہ میں کسی صُورت میں نہیں چاہتا کہ اُسے خبر ہو جائے.. چاہے میں ہمیشہ اپنے انجام تک اس کمرے میں تنہا پڑا رہوں..

میں نے اس آس میں کہ اب تک منڈیر پر دو چار پرندے اتر چکے ہوں گے کھڑکی کے پار نگاہ کی..

اور وہاں.. وہ منحوس چیل پھر سے آ بیٹھی تھی..

میرے دل کی دھڑکن میں یکدم ایک رکاوٹ سی آ گئی، وہ اس بار بے وجہ نہیں آئی تھی، اُس نے میرے حدّت بھرے بدن کی بوسیدگی سُونگھ لی تھی.. میں نے کھڑکی کا پردہ کھینچ کر اُسے اپنی نظروں سے اوجھل کر دیا..

آج صُبح ناشتہ کرنے میں کُچھ دشواری محسوس ہوئی، بمشکل حلق سے نیچے اترا۔۔البتہ دوپہر کا کھانا نگلنا ایک تکلیف دہ عمل تھا، میرے گلے میں سوجن کے آثار تھے اور نگلنے سے اُنہیں ٹھیس لگتی تھی اور ذائقہ بھی ایسا تھا جیسے مُنہ میں کیچڑ بھر گیا ہو۔۔میں نے کُچھ کھائے بغیر کھانے کی ٹرے بلاسوچے سمجھے دروازے کے باہر رکھ دی۔۔اور مُجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔

اب انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔۔

علامتیں واضح ہوتی چلی جاتی تھیں۔۔نقاہت بھی بڑھتی جاتی تھی۔۔

میں کُچھ دیر بخار کی تپش کے خمار میں اونگھتا رہا۔۔

وہ اب وہاں نہیں ہوگی۔۔میں نے اپنے آپ کو ڈھارس دی اور کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔۔

اور وہ موجود تھی۔۔اُسی ساکت حالت میں جیسے سلیٹی پتھر سے تراشی گئی ہو۔۔جیسے اُسے کُچھ غرض نہ ہو۔۔اور غرض تو اُسے تھی، بے وجہ نہیں بیٹھی تھی۔۔

یہ بھی ممکن تھا کہ اُسے واقعی مُجھ سے کُچھ غرض نہ ہو۔۔وہ بھوکی ہو۔۔خوراک کی تلاش

میں ادھر آ نکلی ہو.. نہر کنارے، راوی کے پُل پر بہت سے ضعیف الاعتقاد لوگ چیلوں کی جانب صدقے کا گوشت پھینکتے تھے جو وہ پانی میں گرنے سے پیشتر ہی دبوچ لیتی تھیں.. ان دنوں صدقے کا سلسلہ بھی موقوف ہو چکا ہوگا اور یہ اُن میں سے ایک چیل ہو جو بُھوک کی ماری میری منڈیر پر آ بیٹھی ہو.. لیکن میری منڈیر پر ہی کیوں.. پہلے بھی تو آئی تھی، دوبارہ کس سلسلے میں چلی آئی ہے..

میرے بدن میں وبا کی جو صدائیں پھیل رہی تھیں، جو آثار نمایاں ہو رہے تھے اتنی احتیاطوں کے باوجود تو یہ سب لگتا ہے کہ داتا صاحب کا کرم تھا. وہ کون تھا جس کے سانس سے خارج ہونے والے وبا کے گیلے جرثومے مُجھ میں منتقل ہو گئے تھے.. مُجھ سے دعاؤں کے جو طالب تھے، مُجھ سے لپٹ لپٹ جاتے تھے اُن میں سے کوئی ایک.. نہیں، یہ وہی مردہ بیر بہوٹیوں ایسی آنکھوں والا بدبخت تھا جو مرتے ہوئے کبوتر اٹھالے گیا تھا، اُس نے وبا کا یہ وبال مجھ میں منتقل کیا تھا.. اُسی نے..

میرا بدن ٹھنکنے لگا تھا اور گلے میں سوجن کا احساس قوی ہوتا جاتا تھا. چیل کا ساکت مجسمہ گھات لگائے بیٹھا تھا..

قدیم قصّوں میں بیان ہوا ہے کہ جب کبھی کسی بستی پر وبا کا عتاب نازل ہوتا تھا تو سب سے پہلے حیوانوں میں خطرے کی حس بیدار ہو جاتی تھی، وہ اس کی آمد کی بُو سونگھ لیتے تھے، کتے بھونکنے لگتے تھے، بلّیاں رونے لگتی تھیں اور پرندے اپنے اپنے گھونسلے چھوڑ دیتے تھے.. تو اس چیل کی وبائی حس بھی بیدار ہو چکی تھی اور وہ اس کی بُو سونگھتی میری منڈیر پر آ اتری تھی..

میں نے اپنے بازو کو ناک کے قریب لا کر سونگھا..

میرے بدن میں تو کوئی ایسی بُو نہ تھی جو میری وبا زدگی کی تشہیر کرتی پھرے.. ویسے اس وبا کے آثار میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ انسان نہ صرف ذائقے بلکہ سونگھنے کی حس سے بھی عاری ہو جاتا ہے..

یعنی بُو تو ہو گی لیکن میں اسے سونگھنے سے قاصر ہوں..

چیل دم سادھے بُت بنی بیٹھی رہی..

وہ رات مُجھ پر بہت بھاری گزری..

بخار پرکھنے کے لئے ڈیجیٹل تھرمامیٹر سے رجوع کیا تو اُس کی سکرین پر ابھرتے ہند سے دھندلانے لگے کہ آنکھوں میں بھی بخار بھرا ہوا تھا.. بہر حال بہت غور کرنے پر جو دکھائی دیا، نہ دکھائی دیتا تو اچھا تھا.. بخار ایک سو چار ڈگری سے بھی تجاوز کر رہا تھا..

پہلے بخار کی حدّت میں جو ایک خمار سا تھا جس میں میں اونگھتا رہتا تھا وہ اس کی شدت کی تاب نہ لاسکا اور اب اُس کی جگہ ایک اذیت آزاری نے لے لی تھی جو بدن کو بے چین کئے دیتی تھی.

مُجھے سانس لینے میں بھی دشواری پیش آنے لگی..

وبا سے پیشتر بھی کبھی کبھار سانس لینے میں دقت پیش آتی تھی کیونکہ میرے پھیپھڑوں کے گرد ریشہ جم چکا تھا.. میں سِنک پر جُھک کر کُچھ دیر ذرا زور لگا کر کھانستا تو بلغم کا ایک لیس دار لوتھڑا میرے حلق سے باہر آجاتا اور پھر سانس لینے میں آسانی ہو جاتی.. پر پچھلی شب ایسا نہ ہوا.. میں متعدد بار باتھ روم میں گیا لیکن میرا گلا صاف نہ ہوا بلکہ بار بار زور لگا کر کھانسنے سے میرا سانس بُری طرح پُھول گیا اور میں واپس آکر صوفے پر گر گیا..

سانس لینے میں رکاوٹ آخری علامت تھی جو نمودار ہو چکی تھی..

بخارت کی شدّت، گلے میں سوجن، سانس لینے میں دشواری..اور منڈیر پر بُت بنی بیٹھی چیل..کس کس علامت سے انکار ہو سکتا تھا..

بخار اور گلے کی سوجن تو کسی حد تک برداشت ہو جاتی تھی لیکن یہ سانس کی اُلجھن مُجھے سانس نہ لینے دیتی تھی..

میں سانس کھینچتا تھا تو اذیت سہی نہ جاتی تھی..جیسے سانس کی چادر تیکھے کانٹوں پر گھسیٹی جا رہی ہو اور ہر کانٹا نیزے کی اَنی کی مانند اُس میں چھید کرنے پر تُلا ہو..جیسے کیکر کے کانٹوں پر انگور کے خوشے زخمائے جا رہے ہوں..

پھیپھڑوں میں کرچیاں بھرتی جاتی تھیں..

کیا مُجھے اب کسی کو مدد کے لیے پکارنا چاہیے؟ لیکن وہ پریشان بہت ہوں گے..اولاد کی پریشانی چاہے آپ بسترِ مرگ پر پڑے ہوں، مُردہ ہوتی آنکھوں سے بھی دیکھی نہیں جاتی..

مُجھے کُچھ دیر اور سانس کے زخمائے جانے کی اذیت کو برداشت کرنا چاہیے..شائد غیب سے کوئی مدد آ جائے..یہ علامتیں زائل ہو جائیں..داتا صاحب کو ترس آ جائے کہ یہ شخص گھر والوں سے چوری چھپے میرے ہاں حاضر ہوا تھا اور یہیں سے وبا کا وبال لے کر گیا تو میں اس مصیبت میں اُس کی مدد کو پہنچوں..پر ایسا نہ ہوا..کہیں سے کوئی مدد نہ آئی..ویسے بھی ولی اللہ ہوں، بزرگ پہنچے ہوئے ہوں لیکن اُن کی پہنچ کی بھی حد ہوتی ہے..اور یہ وبا اُس پہنچ سے آگے جا چکی تھی..

وہ خود ہی خدا بنی بیٹھی تھی..

دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی..

ایک لمحہ توقف کا حائل ہوا اور پھر دستک ہوئی..

باہر شام کے کھانے کی ٹرے فرش پر رکھنے کی آواز نہ آئی جو دستک سے چند لمحے پیشتر میرے کانوں میں اترتی تھی..

میں اٹھ نہ سکتا تھا، پڑا رہا..

دروازہ ایک احتیاط بھری آہستگی سے ذرا سا کُھلا اور پھر میرے بیٹے کی متفکر شکل ظاہر ہوئی.. میں جس بے چارگی میں پڑا تھا، اُس کا چہرہ بادِ نسیم کا ایک جھونکا تھا جو میرے تپتے بدن میں ایک ٹھنڈے جھرنے کی مانند سرائیت کرنے لگا.. بہت ہی دن ہو گئے تھے اُسے دیکھے ہوئے..

''بابا..'' وہ میرے قریب ہوا ''آپ نے ناشتے کے لئے بھی کچھ نہیں لیا.. دوپہر کے کھانے کو بھی ہاتھ نہیں لگایا.. آپ ٹھیک تو ہیں ناں بابا..''

میں نے اُن آنسوؤں کو بمشکل روکا جو اتنے دنوں کی تنہائی اور لاچارگی نے

سنبھال رکھے تھے.. بوڑھے یوں بھی بے وجہ رو دیتے ہیں..

''ہاں...'' صرف ہاں ادا کرنے کے لئے مجھے اپنا سانس بُری طرح کھینچنا پڑا اور وہ پھیپھڑوں میں نمودار ہو چکے تھوہر کے کانٹوں پر گھسٹتا گیا جس کے نتیجے میں اس ہاں میں وہ خرخراہٹ بھی شامل ہوگئی جو آخری دموں میں انسان کے گلے میں گھنگھرو کی طرح بجتی ہے..

اُس کا رنگ متغیر ہو گیا اور ہونٹ لرزنے لگے ''بابا..'' میں نے اُس کی جانب آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور اُن میں سے بے اختیار نمی پُھوٹنے لگی..

''آپ کی آنکھیں اتنی سُرخ کیوں ہو رہی ہیں بابا'' اُس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں میرے رخساروں پر رکھ دیں اور یکدم اُنہیں یُوں اٹھا لیا جیسے میرے ڈھلتے رخسار نہ تھے، سلگتے کوئلے تھے.. ''بابا.. بابا'' اُس نے میرے ماتھے کو چُھوا اور اپنا ہاتھ وہیں رہنے دیا اگرچہ وہ بھی تپ رہا تھا.. ''آپ نے بتایا کیوں نہیں بابا.'' اُس نے پھر سے میرے رخساروں پر اپنی لرزتی ہتھیلیاں جما دیں جیسے وہ اُن میں سے پھوٹتی حدت کو روک دینا چاہتا ہے..

اُس کی ہتھیلیوں پر میرے آنسو بہتے گئے..

''مُجھے.. مت چھوؤ..'' میں نے بمشکل گھگیائی ہوئی آواز میں التجا کی ''پرے ہو جاؤ.. مت..'' میں نے اُسے پرے دھکیلنے کی کوشش کی.. وہ پرے نہ ہوا.. میری التجا پر کُچھ دھیان نہ کیا.. آگے بڑھ کر مُجھے اپنے لامبے بازوؤں میں یُوں سمیٹا جیسے خزاں رسیدہ پتوں کے ڈھیر کو بے خطر سمیٹتے ہیں.. اُس نے کُہنی سے دروازے کو پوری طرح کھولا اور مُجھے گود میں

اٹھائے لاؤنج میں آیا، چیختے ہوئے اپنی بیوی کو پکارا.. کار کی چابی.. جلدی جلدی.. کہاں مر گئی ہو'' وہ تو لپکتی چلی آئی، میری حالت دیکھ کر سہم گئی.. بول نہ سکی..

اُس نے مجھے یوں اٹھایا ہوا تھا جیسے وہ گھر سے باہر مٹی میں کھیل رہا ہوتا تھا تو میں اُسے سرزنش کرتا بازوؤں میں بھر کے لے آتا تھا..

میرے پھُنکتے بدن پر اُس کے آنسو ایک تواتر سے گرتے چلے جاتے تھے.. بارش کی بُوندوں کی مانند جو تپتی ہوئی مٹی پر گرتی ہیں تو اُس میں سے ایک ہواڑ اٹھتی ہے.. وہ بار بار کہتا تھا ''بابا آپ نے کیوں نہیں بتایا.. بابا..''

مُجھے صرف اتنا یاد ہے کہ اُس نے مُجھے کار کی پچھلی نشست پر یوں لٹایا جیسے ایک خوابیدہ بچے کو لٹاتے ہیں کہ کہیں وہ جاگ نہ جائے.. بس اتنا یاد ہے..

ایک بے حس غفلت بھرا سناٹا ہے..

بدن کسی سکتے میں اتر چکا ہے..

زندگی جہاں دھڑکتی ہے اُس کے نظام میں خلل آ گیا ہے..

البتہ دماغ کی جانب سے کُچھ غیر واضح بار بار منقطع ہوتے اشارے آ رہے ہیں..میں کسی بلیک ہول میں نگلا جا رہا ہوں جس کے ایک جانب حیات کی کہکشائیں کبھی بُجھتی کبھی جگمگاتی ہیں..اور دوسری جانب اس بلیک ہول کے پار ایک سیاہ بے انت خلاء ہے جس کی جانب میں ایک بے اختیار کیفیت میں لڑھکتا جا رہا ہوں..کوئی نامعلوم جہان ہے اس کے پار جو ایک مقناطیس کی مانند مُجھے اپنی جانب کھینچتا چلا جا رہا ہے..اور طے نہیں، واضح نہیں ہو رہا کہ زندگی کی ڈور کٹ چکی ہے اور یہ اُس کے دھاگے میں آخری لرزشیں ہیں یا ابھی تک کوئی ربط موجود ہے.میں اِدھر ہوں اور اُدھر کے سفر میں ہوں یا میں اُدھر پہنچ چکا ہوں، طے نہیں ہو پا رہا..دماغ کی جانب سے اشارے بھی اب اٹک اٹک کر آ رہے ہیں..

میں مکمل طور پر تو معدوم نہیں ہوا اور نہ یہ اشارے اٹک اٹک کر بھی نہ آتے اس

بے حس غفلت بھرے سناٹے میں احساس کا ایک شرارہ بھی نہ پھوٹتا اگر ڈور کٹ گئی ہوتی، میں معدوم ہو چکا ہوتا..

کہیں نہ کہیں کُچھ طے پا چکا تھا اور میں لاعلم تھا کہ کیا طے پایا ہے..بس اتنا علم ہے کہ یا تو میں فنا کی جانب بڑھتے ایک بہاؤ میں ہوں یا پھر بقا کی جانب بہتا جا رہا ہوں..یا پھر میرا وجود اپنے زمینی وزن سے ماورا ہو کر ایک بے حس کیفیت میں معلّق ہو چکا ہے..

میں آگاہ نہیں ہو پا رہا کہ کیا میرے اندر زندگی کی کوئی رمق موجود ہے یا وہ بھی کب کی رخصت ہو چکی ہے، آخری چنگاری راکھ ہو چکی اور اب میں ٹھنڈا جانے لگا ہوں..

بلیک ہول کی گُھپ گھپا میں ایک کشتی ہے، ایک بلاوا..ایک کھنچاؤ ہے لیکن میں کہیں نہ کہیں بندھا ہوا ہوں، منقطع نہیں ہوا..اُس کی کشش مغلوب کرتی ہے، بلاتی ہے..مُجھ میں داخل ہو جاؤ اُس کے پار ایسے جہان ہیں جو ابھی تمہارے لئے تخلیق کئے گئے ہیں..آ جاؤ..کشش مغلوب کرتی ہے..

کُچھ آوازیں آ رہی ہیں..

واضح نہیں بجھے بجھے مبہم جیسے کسی کائناتی دوری پر واقع کسی سیّارے کی جانب سے سگنل آ رہے ہیں جنہیں میں ڈی کوڈ کرنے سے قاصر ہوں..مدھم آوازوں کی بھنبھناہٹ میرے کانوں میں سرگوشیوں کی مانند اترتی ہے..اور میں اخذ کرتا ہوں کہ میری حسیات مکمل طور پر مُردہ نہیں ہوچکی، مُجھے کُچھ سنائی دے رہا ہے..اُس بے حس مدہوشی کے عالم میں بھی آوازوں کی بھنبھناہٹ میں سے کوئی ایک لفظ الگ ہو کر واضح ہو جاتا ہے..کورونا..کورونا..وینٹی..وینٹی لیٹر..

میری آنکھوں کے پپوٹے جو گھپ اندھیروں میں تھے اُن میں روشنی جذب ہو رہی ہے.وہ روشنی کبھی بجھ جاتی ہے اور کبھی لَو دینے لگتی ہے..میری آنکھیں کُھل جاتی ہیں، اُن میں بخار کے ڈیرے ہیں، نمی کی گیلاہٹ ہے..دودھیا رنگ کی بیمار سی روشنیاں میرے وجود پر سے گزرتی جاتی ہیں..

دماغ کی جانب سے آنے والے اشاروں میں بار بار جو گانٹھیں پڑ جاتی تھیں،

اُن میں سے کُچھ ڈھیلی ہو کر کُھل جاتی ہیں.. آوازیں واضح ہونے لگتی ہیں، مُجھے سنائی دے رہا ہے..

''اسے وینٹی لیٹر پر ڈالنے سے کُچھ فائدہ نہیں.. امکان کم ہے..''

''نہ ہونے کے برابر... بہت بوڑھا ہے.. لیکن اس کا بیٹا اصرار کر رہا تھا..''

''سب بیٹے اصرار کرتے ہیں لیکن یہ زیادتی ہے. وہ وینٹی لیٹر جو کسی نوجوان کے سانس بحال کر سکتا ہے اُسے ویسے بھی اب تک زائد المیعاد ہو چکے بوڑھے پر کیوں ضائع کیا جائے..''

''ہاں.. تعداد پہلے ہی بہت کم ہے..''

آوازیں جیسے کسی گلیشیر کی دراڑ میں سے برآمد ہو رہی ہوں.. سرد اور لاتعلق.. انسانی محسوسات سے ماورا.. میری آنکھیں کُھلی ہیں..

''حکومت کی جانب سے مسلسل اعلان ہو رہے ہیں کہ ہر ہسپتال میں وافر وینٹی لیٹر میسّر ہیں.. یہاں کا حال دیکھ لو.. آئی سی یُو میں سسکتے مریض شکر کرتے ہیں جب اُن کے آس پاس کوئی شخص دم توڑ جاتا ہے اور اُس کا وینٹی لیٹر اُن میں سے کسی خوش نصیب کے حصّے میں آ جاتا ہے..''

آوازوں کی شناخت واضح ہو رہی ہے..

''کیا پتہ یہ بچ جائے'' آواز کم عمر اور نسوانی تھی ''ابھی کل ہی اس سے بھی عُمر رسیدہ ایک شخص تندرست ہو کر ڈسچارج ہوا ہے.. کیا پتہ..''

''اس کے پھیپھڑے بہت ناکارہ ہو چکے ہیں، اُن میں کورونا بھرا ہوا ہے..''

میں دھکیلا جا رہا ہوں اور دودھیا روشنیاں میرے بدن پر سے سرکتی جاتی ہیں..

''آئی سی یو میں پہنچتے ہی ڈیوٹی پر مامور ڈاکٹر سے مشورہ کر کے بوڑھے کو پیتھے ڈین کا ایک اور انجکشن لگا دو.. آنکھیں کھول رہا ہے.. شائد ہوش میں آ رہا ہے.. ہوش میں آ گیا تو اسے بہت اذیت ہوگی..''

میں اُس بے حس مدہوشی کی کیفیت میں سے ایک خمار آلود نیم بیہوشی میں منتقل ہو رہا ہوں..

وہ دودھیا روشنیاں جو وقفے وقفے سے میرے بدن پر سے گزرتی جاتی تھیں ہسپتال کی راہداری کی چھت پر نصب ہیں..

اُن انسانی آوازوں میں جو مُجھے سنائی دے رہی ہیں کبھی کبھی ایک چرچراہٹ شامل ہو جاتی ہے جیسے کوئی شے گھسیٹی جا رہی ہو، کسی بچّے کی سائیکل زنگ آلود ہوگئی ہو..

پھر مُجھے احساس ہوتا ہے کہ میں ایک بوسیدہ ہو چکے سٹریچر پر پڑا ہوں جسے دھکیلنے والے باتیں کر رہے ہیں، وہ میری پہچان میں نہیں آ رہے، دُھند میں تحلیل ہوتے کُچھ چہرے ہیں..

وہ مُجھے ایک انسان کی بجائے آٹے کی ایک بوری کی مانند لاپروائی سے دھکیلتے جا رہے ہیں..

یہ جو چرچراہٹ کی دل خراشی ہے یہ سٹریچر کے بائیں پہیّے میں سے برآمد ہو رہی ہے اور وہ اس کی خستگی کو خاطر میں نہیں لا رہے، دھکیلتے جاتے ہیں، جلد از جلد مُجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں..

میرا بدن ابھی تک سُن ہے لیکن میں سُن سکتا ہوں..

میرا سانس اکھڑتا محسوس ہونے لگا ہے..

بلیک ہول کی گھپ اندھیری گپھا میں ایک کشش ہے..ایک کشش ہے..

میرے بس میں کُچھ نہیں ہے، اگر ہوتا تو میں بخوشی اُس اندھیری گپھا میں اتر جاتا اور ایک ابدی سکون کے گلے لگ کر سو جاتا..

میں پھر سے ایک تاریک غنودگی میں اتر رہا ہوں..اتر رہا...ہوں..

ایک عجیب سا سناٹا میرے کانوں میں اتر رہا ہے. جیسے لوگ شور و غل کرتے یکدم چُپ ہو جائیں ایسا سناٹا ہے جو بولتا ہے.. ایک ٹھنڈک ہے جس نے میرے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے. اس سناٹے میں ملفوف کُچھ آہیں، کُچھ سسکیاں سنائی دے رہی ہیں.. شائد کوئی کراہ رہا ہے.. یہ سب گمان کے سرابوں میں کبھی سنائی دیتا ہے اور کبھی پھر سے خاموشی طاری ہو جاتی ہے.

نیند عارضی موت میں اترنے کا تجربہ ہے.. یہ کیسے طے ہو کہ یہ عارضی ہی ہے، دائمی نہیں..

اور ہاں میرے کانوں میں سٹریچر کی چرخ چُوں نہیں اتر رہی.. میں کہیں تھم چکا ہوں.. ساکت ہو چکا ہوں..

انتہائی نگہداشت کے وارڈ کی ٹھنڈک میں ایک موت بھری آسودگی ہے..

میں غفلت کی کیفیت میں ڈوبا دماغ کی جانب سے آتے اشاروں کو محسوس کر رہا ہوں..

وہ دیئے کی گیلی بتّی کی مانند پٹاخے چھوڑتے کبھی منقطع ہو جاتے ہیں، کبھی جُڑ جاتے ہیں..

مُجھے اپنے ہونے کا احساس ہو رہا ہے..اگر ہوں تو کہاں ہوں..بے حسی سے چھلکتی کائنات ہے، جس میں میرا وجود کہیں ٹھہرا ہوا ہے، سکوت میں ہے.

آ گہی کے جو سنگل موجود اور ناموجود کے درمیان بھٹکتے پھرتے تھے، جُڑنے لگے ہیں. کہیں نہ کہیں حسیات کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ میں سے جنم لینے والی ہوا مُجھے محسوس ہونے لگی ہے. کُچھ نہ کُچھ ہے جو میرے احساس پر اثر انداز ہو رہا ہے. نہ میں مکمل طور پر مدہوشی کے عالم میں کھو چکا ہوں اور نہ ہی میں ہوش کے کسی زینے پر قدم رکھ رہا ہوں لیکن..

میں ہوں..موجود ہوں!

میں جس کائنات میں بھی موجود کی صورت گری کے خواب میں ہوں، جانتا نہیں کہ کتنے زمانوں کے بعد، کتنے روز و شب بیت چکنے کے بعد میں ہوش کے موہوم سے احساس سے آشنا ہو رہا ہوں..

ہوش کی قربت مُجھے اس لئے بھی محسوس ہونے لگی ہے کہ سانس کھینچنے کا جو پُر خار عمل ہے میں اُس سے آگاہ ہو رہا ہوں..سانس آ جاتا ہے، مُشکل سے آتا ہے..گلے میں خرخراہٹ کے سٹریچر کی مانند گھسٹتا ہے، اکھڑتا ہے اور پھر سے آ جاتا ہے.

ابھی ہر سُو تاریکی ہے.. پانیوں پر دُھند تیرتی ہے..ان پانیوں میں حیات کی کوئی رمق نہیں..ان پر ابھی تک کوئی اسم نہیں پھونکا گیا. میرا وجود اُن پانیوں میں ایک ایسی بُوند کی مانند ہے جس کی کوئی شناخت نہیں، اپنی کوئی حیثیت نہیں، وہ اپنی شناخت کے لئے پانیوں کا محتاج ہے. اور وہ خود ابھی شناخت کے مرحلوں سے گزر رہے ہیں.

میں ہوش کے زینے پر پہلا قدم رکھتا ہوں..اور مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں مختلف نوعیت کی نالیوں اور پائپوں میں بندھا ہوا ہوں..اوران نالیوں میں کوئی محلول ہے جو ہولے ہولے سرکتا ہے، سرد ہوا ہے جو سرائت کرتی ہے..وہ دُھند جو تاریک پانیوں پر ٹھہری ہوئی ہے اُس میں کُچھ ہے..کوئی شے ہے جو ہولے ہولے ابھرتی ہے یہاں تک وہ میرے اس سراب میں حقیقت کا رُوپ دھار لیتے ہیں..اور یہ میرے کمرے کی کھڑکی کے باہر جو منڈیر ہے اُس کا رُوپ دھار لیتی ہے..

اُس منڈیر پر وہ حنوط شدہ لگتی چیل پَر سمیٹے بیٹھی ہے..

وہ یہاں اس موجود اور ناموجود کی جس کائنات میں، میں ہوں، یا نہیں ہوں، کیسے نمودار ہو گئی..خود سے نمودار ہوئی ہے یا اُسے مامور کیا گیا ہے..

اُس چیل کی نموداری نے میرے اندر اپنی حیات کے دفاع کے لئے جتنے بھی ناکارہ ہوتے نظام تھے اُن سب کو یکدم متحرک کر دیا ہے..

وہ چیل فنا کا جو سندیسہ لے کر آئی ہے میں اُسے قبول کرنے سے انکاری ہونے کی سعی کرنے لگتا ہوں..

تاریک پانیوں کے بے انت پھیلاؤ پر جو دُھند ٹھہری ہوئی ہے، وہ گھنی ہونے لگتی ہے..دُھند گہری ہوتی جاتی ہے..منڈیر اور اُس پر براجمان وہ چیل بھی دُھندلائے جا رہے ہیں، دُھند میں دُھند ہوتے ڈوبتے جاتے ہیں، معدوم ہو جاتے ہیں، پانی پھر سے اپنی سابقہ ہموارگی اختیار کر لیتے ہیں، حقیقت اور واہمے کے درمیان جو کچی ڈوری ہے اُسے

تھامتے ہوئے میری آنکھیں جو سراب اور خواب کے خمیر سے گندھی ہوئی ہیں اُس مقام پر ٹھہری رہتی ہیں جہاں ابھی ابھی وہ منڈیر اور چیل تحلیل ہوئے تھے، پانیوں میں ڈوب گئے تھے..

میری آنکھیں اُس مقام پر تھم گئی ہیں، جیسے کسی کا عزیز پانیوں میں ڈوب جائے تو وہ اُس جگہ کو تکتا جاتا ہے جہاں ڈوبنے سے پیشتر وہ آخری بار نظر آیا تھا. میں بھی اُس مقام کو ایسے دیکھتا جاتا ہوں جیسے مُجھ پر کسی جادوٹُونے کا اثر ہو چکا ہے، چاہوں تو بھی آنکھیں جھپکنے سے قاصر ہوں..

اُس جگہ کو تکتا جاتا ہوں جہاں وہ منڈیر اور چیل آخری بار نظر آئے تھے اور پھر ڈوب گئے تھے..وہاں کوئی گرداب نہیں ہے، پانی ہموار ہو چکے ہیں..

فاختہ اڑان میں ہے..

اُس کی گردن کے سیاہ پروں پر سفید دھبے ہیں..

وہ تھکتی جاتی ہے..اڑتی جاتی ہے، خشکی تلاش کرنے کی آرزو میں..اور یہ آرزو عجب ہے، اس کے پورا ہونے کا امکان نظر نہیں آتا، خشکی نظر نہیں آتی..

اُس کے بس میں کُچھ نہیں..وہ بس اڑتی جاتی ہے..اڑان جاری رکھتی ہے..وبا کے پانیوں کا کوئی کنارا نہیں، پھیلاؤ کی کوئی حد نہیں، یہ سمٹنے والے نہیں لگتے..شائد وہ پہلے سے بھی زیادہ گہرے اور وسیع ہو چکے ہیں..

اُس کا بدن تھکاوٹوں سے بے حس ہو رہا ہے اور اُس کے پَر جیسے ایک بے مقصد سعی ہو پھڑ پھڑاتے حرکت میں مگن ہیں..

اور فاختہ اڑتی جاتی ہے..

میرے اندر داخل کئے گئے بے ہوشی کے محلول اثر انگیزی سے عاری ہوتے جاتے ہیں.. اُسی حساب سے کچھ درد لوٹتے آتے ہیں..

میں اپنے آس پاس سے آگاہ ہوتا جاتا ہوں..

انتہائی نگہداشت کے وارڈ کی سرد مہری اور اس میں پھیلی بے رُوح دودھیا روشنی کے ماحول سے شناسا ہوتا جاتا ہوں..

چونکہ مُجھے متعدد نالیوں نے جکڑ رکھا ہے اور میرے چہرے پر ماسک پیوست ہے جس میں سے سانس کے راستے آکسیجن کی صُورت چلے آ رہے ہیں اس لئے میں گردن موڑ کر برابر کے بستر پر پڑے مریض کی جانب دیکھنے سے قاصر ہوں لیکن اُس مریض کے اکھڑتے سانسوں میں جو ارتعاش ہے اُسے محسوس کر سکتا ہوں.. اُس کی لاچارگی کی لہریں آرزو کی صُورت مُجھ تک پہنچ رہی ہیں کہ کب یہ بوڑھا شخص تمام ہو اور کب اس کے سانسوں کی ڈوری قائم رکھنے والا وینٹی لیٹر میرے ہانپتے ہوئے چہرے کے حصّے میں آ جائے.. میں اُس کی اس آرزو پر معترض نہیں ہو سکتا، اگر میں اس کی جگہ ہوتا اور میرے پہلو میں ایک

ناکارہ بوڑھا ایسا پڑا ہوتا جس کی عمر کی نقدی یوں بھی ختم ہونے والی ہوتی اور خواہ مخواہ ایک وینٹی لیٹر کے سہارے چلتا جاتا، بے وجہ، بغیر کسی مستقبل کے تو میں بھی اُس کے مرنے کا منتظر رہتا۔۔اُس کے وینٹی لیٹر کے لیے حریص ہو جاتا۔۔

میں آس پاس سے آگاہ تو تھا لیکن میری آنکھوں کے سامنے ابھی تک دُھند کا وہ پردہ تنا تھا جہاں کُچھ دیر پہلے ایک منڈیر ابھری تھی جس پر منتظر پتھر بنی ایک چیل تھی اور پھر وہ دونوں اس دُھند میں تحلیل ہو گئے تھے۔۔میں اُس مقام کو تکتا جاتا تھا، ایک سحر زدہ خرگوش کی مانند اُس مقام کو تکتا جاتا تھا۔۔

انتہائی نگہداشت کا وارڈ زندگی اور موت کے درمیان ایک پڑاؤ ہے۔۔کبھی موت کھینچتی ہے تو زندگی اُسے روکتی ہے اور کبھی زندگی حاوی ہونے لگتی ہے تو موت اپنا سیاہ بوجھ پلڑے میں ڈال کر اُسے اپنی جانب جُھکانے لگتی ہے۔۔یہ ہوش اور بے ہوش کے درمیان ایک برزخ ہے۔۔اور یہاں بھی قیام دائمی نہیں رہتا، ڈانواں ڈول ہوتا رہتا ہے۔کبھی ہوش کے آنگن میں اور کبھی بے ہوشی کی تاریک کھائی میں۔۔اس وارڈ میں پلڑے اگر برابر رہتے ہیں تو تادیر نہیں رہتے۔۔کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔۔اور نہ ہی یہاں وقت کی گزران کا کوئی پیمانہ ہے۔۔شب و روز کا، ماہ و سال کا کُچھ حساب نہیں۔۔ایک لمحہ بیتا ہے یا بے حساب سورج ابھرے اور ڈوب گئے، کُچھ شمار نہیں۔محسوس یہی ہوتا ہے کہ اُس مُردہ ٹھنڈک میں وقت تھم گیا ہے۔۔تمام گھڑیوں کی سوئیاں رُک گئی ہیں۔۔

تو مُجھے کُچھ حساب نہیں کہ میں کن زمانوں میں سیاہ پانیوں پر ٹھہری ہوئی دُھند کو تکتا جا رہا ہوں۔۔اُس مقام پر آنکھیں نصب کر چکا ہوں جہاں جانے کس زمانے میں ایک

منڈیر اور اُس پر براجمان ایک چیل ڈوبی تھی.. اور تب کیا جانئے کہ کونسے زمانے آئے، بے حساب شب و روز وارڈ کی دودھیا روشنی میں دفن ہوئے جب مُجھے شک ہوا کہ یہ میرے مسلسل تکتے جانے کا، ارتکاز کا شعبدہ ہے، اُن پانیوں پر آنکھیں ہمہ وقت نصب رکھنے کا شائبہ ہے جو ظہور پذیر ہو رہا ہے.. وبا کے پانیوں کی ہموار سطح پر کُچھ لہروں نے جنم لیا.. جیسے کسی جھیل کی گہرائی میں کوئی مچھلی کروٹ بدلتی ہے تو اُس کی سطح پر لہروں کے دائرے سے نمودار ہوتے ہیں.. پانیوں کے اس خفیف سے تلاطم میں سے منڈیر کا سراب ہولے ہولے ابھرا اور پھر ساکت ہو گیا..

صرف ایک فرق کے ساتھ..

منڈیر اب ویران پڑی تھی..

وہ چیل جس کے بارے میں میرا گمان تھا کہ وہ مامور کر دی گئی ہے، اُس نے بُو سونگھ لی ہے وہاں موجود نہ تھی.. ڈوب چکی تھی..

منڈیر میری آنکھوں میں نقش ہو گئی..

اس ارتکاز اور نیم مدہوشی کے تحیّر کے موسموں میں میرے کانوں میں ایک سرسراہٹ سی ہوئی جیسے تتلیوں کا ایک غول سرسراتا ہوا سنائی دینے لگا ہو.. پھر اُس سرسراہٹ میں سے ایک اجنبی ارتعاش نے یکدم جنم لیا.. جیسے بے انت بے آب مچھلیاں پھڑکتی ہوں. بے حساب پرندوں کے پروں کے پھیلاؤ کی پھڑ پھڑاہٹ کا شور ہو.. یہ کیسا غُل ہے.. کیا یہ آخری آوازیں ہیں جو مجتمع ہو کر میرے کانوں میں اتر رہی ہیں اور ان کے بعد ہر سُو سناٹا چھا جائے گا.. میں مر جاؤں گا..

پھڑک اور پھڑ پھڑاہٹ کا یہ شور بڑھتا چلا گیا.. پانیوں میں سے ابھر چکی منڈیر کی بناوٹ مزید واضح ہو چکی تھی اور وبا کے بے انت پانیوں کے پھیلاؤ پر جو دُھند ٹھہری ہوئی تھی اُس میں سے ایک پرندہ نمودار ہو رہا تھا جس کے پروں کا پھیلاؤ مُجھے یوں دکھائی دیا جیسے وبا کے پوری دنیا میں بکھرے ہوئے پانیوں پر محیط ہوا جاتا ہے. کہیں یہ ایک اور بلا کا نزول تو نہیں جو پرندے کا روپ دھار کر آسمانوں سے اتر رہی ہے.. میں اگرچہ اپنے آپ کو ایک پرندہ ایکسپرٹ سمجھنے لگا تھا لیکن میں اس پرندے کی نسل کی شناخت کرنے سے قاصر تھا.. میری آنکھوں میں ابھی تک وبا کے جرثومے بھرے ہوئے تھے اور میری بینائی دھندلائی ہوئی سی تھی شائد اس لئے میں اُس پرندے کی نسل اور جسامت کو پرکھ نہیں سکتا تھا. علاوہ ازیں جب وہ اُس گھنی دُھند میں سے ظاہر ہوا ہے تو اُس کے وجود کے گرد بھی دُھند کی ایک تہہ لپٹی چلی آ رہی تھی.. میں اُسے کیسے پہچان سکتا تھا.. دھندلاتی ہوئی بینائی کے ساتھ دُھند میں ملفوف اُس پرندے کو کیسے پہچان سکتا تھا.. اور اُس لمحے جب میں اُس کی شناخت کے وسوسوں میں مبتلا تھا، پھڑک اور پھڑ پھڑاہٹ کا وہ شور یکدم موقوف ہو گیا جیسے اُسے کسی بلیک ہول نے نگل لیا ہو.. ہر سُو ایک سکوت طاری ہو گیا.. ایک چُپ تھی جو وبا کے پانیوں کے بے حساب پھیلاؤ پر حاوی ہو گئی..

وہ پرندہ جیسے کہیں تحلیل ہو گیا ہو..

البتہ وہ منڈیر مزید واضح ہوتی جاتی تھی..

اور وہ خالی تھی..

فاختہ اڑان میں تھی.

وہ تھکاوٹوں کے جہان کی کلفتوں اور اذیتوں کے پار بے حسی کی ایک کیفیت میں داخل ہو چکی تھی..

اُس میں جتنی سکت بھری ہوئی تھی، صرف ہو چکی تھی، اُس کے بال و پر کی رگوں میں جتنا خون گردش میں تھا وہ بھی تھکاوٹوں کی رکاوٹوں سے اٹک اٹک جاتا تھا..

اُس نے اپنی بھرپور کاوش کر دیکھی تھی، اتنے طویل فاصلے اپنے اڑان تلے لے آئی تھی جو آج تک کسی فاختہ نے طے نہ کیے تھے..

نسلِ انسانی کی بقا کی خاطر وہ خشکی کا ایک چپّہ بھی تلاش نہ کر سکی تھی، اُس کی جستجو اور کاوشیں رائیگاں گئی تھیں.. لگتا تھا کہ وبا کے پانیوں نے نسلِ انسانی اور حیوانی کو نگل لیا تھا، ہمیشہ کے لئے اور اُن سب کا خون اُس کی گور گردن پر تھا کہ وہ اُن کی بقا کے لئے خشکی تلاش کرنے میں ناکام ہو گئی تھی، روئے زمین پر کہیں خشکی کے آثار تھے ہی نہیں تو وہ کیسے اُنہیں تلاش کر سکتی تھی..

میرے زندہ رہنے کا بھی کُچھ جواز نہیں.. کُچھ جواز نہیں..
مُجھے اپنے آپ کو وبا کے پانیوں کے سُپرد کر دینا چاہیے..

اس طویل زمانوں پر محیط اڑان کے دوران وہ کبھی تھکاوٹ سے لاچار ہو کر گری، کبھی اُس کی سکت نے ہتھیار ڈال دیئے اور کبھی وہ بے اختیار گری لیکن ڈوبنے سے چند لمحے پیشتر ہمیشہ سنبھل گئی..

اب معاملہ مختلف تھا..اُس نے جان بُوجھ کر اپنے بال و پَر پر جتنے اختیار تھے موقوف کر دیئے اور وہ گری..فاختہ پروں کی پوٹلی تھی، پروں کی دھجیوں سے بنایا ہوا بچوں کا ایک گیند تھی اور یہ گیند لڑھکتا گرتا جا رہا تھا اُن پانیوں کے پھیلاؤ کی جانب جن میں اُسے ہمیشہ کے لئے دفن ہو جانے کی آرزو تھی..اُسے کُچھ پرواہ نہ تھی کہ اُس کی تدفین کے لئے کتنے ڈوب چکے سورج، ڈھل چکے چاند اور بجھ چکے ستارے آتے ہیں..

اور پانی تیزی سے نزدیک آتے گئے..جیسے وہ اُن کے نزدیک نہیں ہو رہی بلکہ پانی ہیں جو اُس کی جانب لپکتے چلے آتے ہیں..اور حیرت در حیرت کہ اُن پانیوں پر ایک دُھند ٹھہری ہوئی تھی اور وہ تاریکی میں تھے..عین اُس لمحے جب وہ پانیوں کی جانب گرتی چلی جاتی تھی اور پانی اُس کی جانب اُمڈتے چلے آتے تھے..وہ اگرچہ بے اختیار ہو چکی تھی لیکن اُس کی آنکھیں ابھی اختیار میں تھیں، اُن آنکھوں نے دیکھا کہ پانیوں پر معلق دُھند میں کُچھ ابھرا ہوا ہے.اور فاختہ کی اُن آنکھوں میں توانائی کی جتنی بھی رمق تھی وہ مرکوز ہوئی اُس شے پر جو ظاہر ہو رہی تھی.

اور وہاں خشکی تھی..

اُس کے رُوں رُوں نے دوہائی دی، وہاں خشکی ہے.. خشکی ہے..

ایک منڈیر تھی..

بے انت، بے انتہا پانیوں کے پھیلاؤ میں خشکی کی ایک علامت ابھر چکی تھی، ایک جزیرہ نمودار ہو چکا تھا، نمودار تب ہوا جب پانیوں نے بالآخر سمٹنے کا ارادہ کرلیا یا اُن کو اذن مل گیا کہ بس اب سمٹ جاؤ..

اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا، اُسے اپنے آپ کو پانیوں میں دفن ہونے سے بچانا تھا تا کہ وہ واپس جا کر کشتی والے کو وہ خبر دے جس کا وہ اور کشتی میں پناہ لئے ہوئے انسان اور حیوان منتظر تھے..

فاختہ نے اپنی اُس بے اختیاری کو جو اُسے لُڑھکاتی، گھماتی، بے بس کرتی پانیوں کی موت کی جانب لئے جا رہی تھی اُسے اپنے اختیار میں کیا.. بدن کے وہ روئیں جن کی جڑیں سُوکھ چکی تھیں، مُردہ ہونے کو تھیں اُن میں اُس لمحے غیب سے جو زندگی کی رمق اتری تھی، اُسے بھرا.. اور اس غیبی رمق نے ہر روئیں کو کہا، رُک رُک.. بے اختیاری کی پھڑ پھڑاہٹ سے کہا تھم تھم اور بال و پر میں رُکتے ہوئے خون سے کہا، رواں ہو، رواں ہو..

منڈیر تیزی سے نزدیک آتی جاتی تھی اور جب اُس کے درمیان چند لمحوں کا مختصر فاصلہ رہ گیا تو یکدم وہ اُس سکت اور قوت کو بروئے کار لائی جو ابھی اُسے عطا ہوئی تھی. اور منڈیر کے عین اوپر ایک پل کے لئے معلّق سی ہوگئی اور پھر اگلے پل وہ گری نہیں اپنے اختیار میں آ چکے نئی حیات کی پھونک سے زندہ ہو چکے بال و پر کو سنبھال کر آرام سے خشکی کے اُس ٹکڑے پر اتر گئی جس کی تلاش میں وہ اڑان کی کئی زندگیاں بسر کر چکی تھی. بار بار

مرنے کو تھی اور ہر بار جی اٹھی تھی..

فاختہ منڈیر پر ایسے براجمان ہوگئی جیسے یہ اُس کا وہ گھونسلا ہو جس میں وہ ازل سے رہتی تھی..

وہاں جہاں دُھند ٹھہری ہوئی تھی، میں نے دیکھا تھا کہ وہاں ایک پرندہ نمودار ہورہا تھا جس کے پروں کا پھیلاؤ مُجھے یوں دکھائی دیا جیسے وبا کے پوری دنیا میں بھرے ہوئے پانیوں پر محیط ہوا جاتا ہے..کہیں یہ ایک اور بلَا کا نزول تو نہیں جو پرندے کا رُوپ دھار آسمانوں سے اتر رہی ہے..

اور تب پھڑک اور پھڑ پھڑاہٹ کا وہ شور یکدم موقوف ہوگیا جیسے اُسے کسی بلیک ہول نے نگل لیا ہو.. ہر سُو ایک سکوت طاری ہوگیا..ایک چُپ تھی جو وبا کے پانیوں کے بے حساب پھیلاؤ پر حاوی ہوگئی..

وہ پرندہ کہیں تحلیل نہ ہوا تھا..

وہ میری منڈیر پر اترا ہوا تھا..

میں پہچان گیا وہ ایک فاختہ تھی.اُس کی گردن کے سیاہ پروں پر خوش نظر سفید دھبے تھے.. یہاں کی نہ تھی، دور کے دیسوں سے آئی تھی..

میں اپنی آنکھوں پر یقین نہ کرسکا کہ اُن کی دُھندلاہٹ پل بھر میں دُھل گئی،

میری بینائی کانچ کی مانند شفاف ہو کر جیسے کھنکنے لگی، فاختہ کی دید نے میری آنکھوں کو نواں نکور کر دیا.. میں بے یقینی سے اُسے تکتا جاتا تھا. یہاں تک کہ اس ارتکاز نے فاختہ کا پورا وجود مُجھ میں منتقل کر دیا.. میرے پھیپھڑوں میں کانٹوں کی جو فصل اُگ آئی تھی جس پر میری سانس کی چادر گھسیٹی جاتی تھی، اُن کانٹوں کی نوکیں موم ہو کر پگھل گئی، نابود ہو گئیں.. فاختہ جو میرے اندر موجود تھی اُس کی کُوک نے کانٹوں کی فصل کو جڑوں سے اکھاڑ دیا اور اُن جڑوں میں سے ہری بھری نوزائیدہ کونپلیں پھوٹنے لگیں جن پر میرا سانس اُلجھتا نہ تھا، ہولے سے بادِ نسیم کی مانند چلتا تھا.. میرے اندر وبا کا جتنا زہر تھا وہ زائل ہوتا چلا گیا اور اُس کی جگہ میری شریانوں میں تازہ ہمکتا ہوا خون یوں جوش مارنے لگا جیسے میں ابھی ابھی اس دنیا میں وارد ہوا ہوں..

خون کے ہر ذرّے میں سے حیات کی نوخیز کومل کلیاں کھلتی جاتی تھیں..

اور وہ فاختہ..

وہ اُس منڈیر پر یوں براجمان تھی جیسے یہ اُس کا وہ گھونسلا ہو جس میں وہ ازل سے رہتی تھی.

وہ نسلِ انسانی کی بقا کی نوید لے کر آئی تھی..

اُس کے تسلسل کی خوش خبری لے کر آئی تھی..

وہ اُس کے منقطع ہونے کی تردید لے کر آئی تھی.

تصدیق کرنے آئی تھی کہ وبا کے یہ پانی سمٹ جائیں گے، تندور جن میں سے وہ ابلے تھے اُن میں واپس دفن ہو جائیں گے..

کشتی کنارے پر لگ جائے گی..

میری کانچ ایسی شفاف ہو چکی آنکھوں میں بینائی کے ان گنت چراغ جل اُٹھے.. ہر چراغ کی لو میں ایک فاختہ تھی جو دور دیسوں سے آئی تھی اور روشنائی کی اُس دمک میں میں نے دیکھا کہ فاختہ کی چونچ میں خشکی کی ایک نشانی ہے.. کیکر کے زرد پھولوں کی ایک لڑی ہے، دھریک کے کاسنی پُھولوں کا ایک گُچھا ہے.. یا شائد زیتون کی ایک شاخ ہے.

پانی سمٹ جائیں گے..

کشتی کنارے پر لگ جائے گی..

فاختہ منڈیر پر بیٹھی تھی اور اُس کی چونچ میں خشکی کی ایک نشانی تھی.. فاختہ منڈیر پر بیٹھی مُجھے دیکھے جا رہی تھی..

اور میں فاختہ کو تکتا جاتا تھا..

6/جولائی 2020ء

لاہور
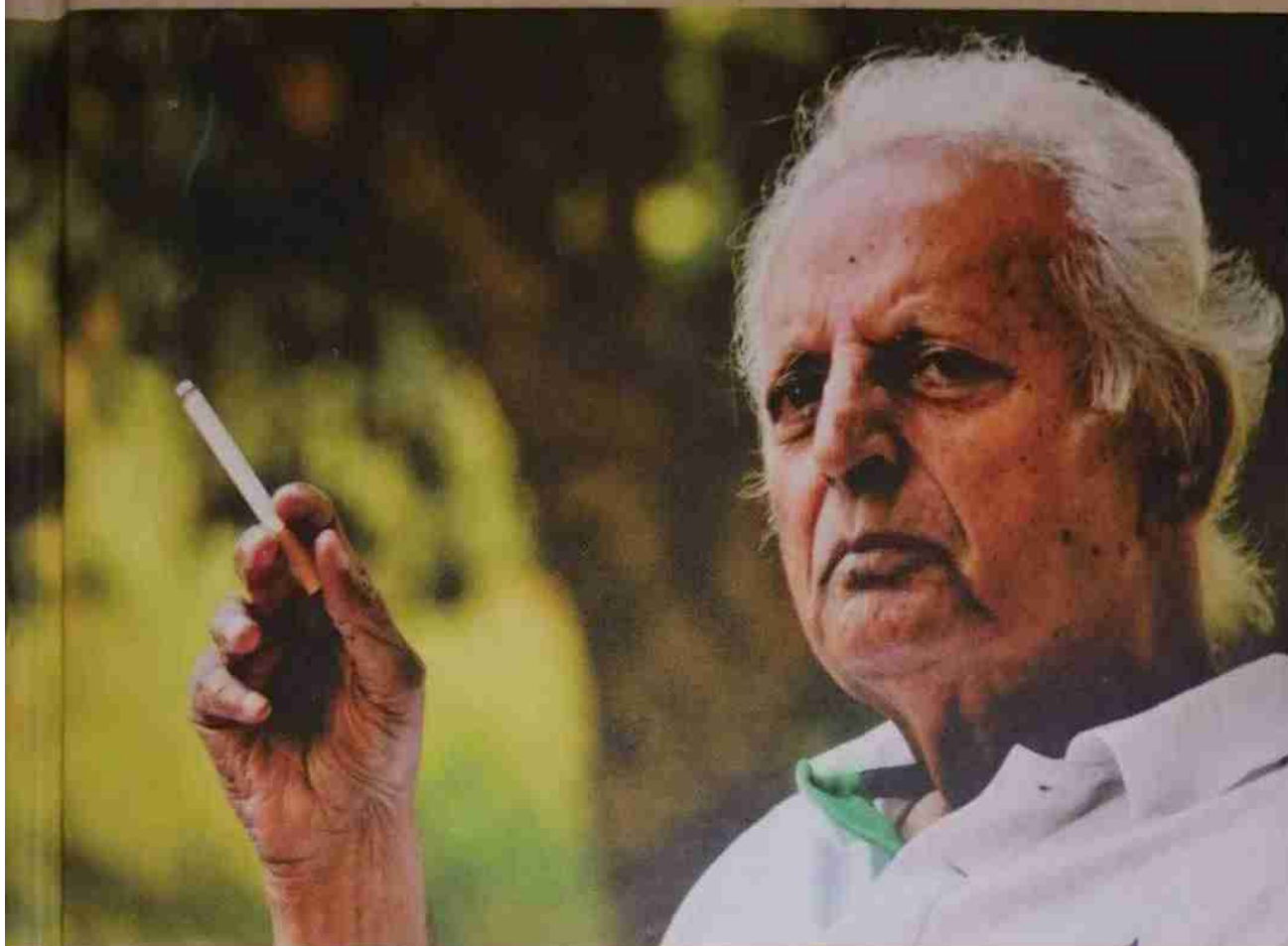
Portrait by: Hafeez Tahir
Walled City 1, Sumair Tarar, 2020
Rs. 800.00
www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-3314-3
ISBN-13: 978-969-35-3314-9
9 789693 533149